خلافت و امامت

حصہ سوم

بار دوم

مرتبہ

ادارہ :- امامیہ مشن لکھنؤ

پبلشر

سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری

امامیہ مشن لکھنؤ

مطبوعہ

یوسفی پریس لکھنؤ

قیمت ۱۵ ار

محصول ۔ ار

رسالہ نمبر ۴۵

۳

مسئلۂ خلافت و امامت؎

ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے

"کاوشِ تحقیق" فطرت کا سرمایہ ہے جو بعض دماغوں میں خصوصیت کے ساتھ ودیعت کر دیا گیا ہوتا ہے۔ وہ انسان کو کبھی کبھی بحث و نظر کے ایسے خشک و ناہموار راستوں میں پہنچا دیتا ہے جن کے تصور سے بھی وہ افراد جو صرف "دماغی عیاشی" کا ذوق رکھتے ہوں کانوں پہ ہاتھ رکھنے لگیں۔

بھلا کون کہہ سکتا تھا کہ "نگار" کے صفحات پر "جنت نگاہ" اور "فردوس گوش" تذکروں کے بجائے ایک وقت میں مسئلہ "خلافت و امامت" کے سے "دقیانوسی" مسئلہ کو چھیڑا جائے گا

۱؎ نگار جنوری نمبر سنہ ۱۹۳۷ء

تعارف

ے شہر کے موقر رسالے "نگار" کے مارچ سنہ ۳۵ء کے پرچے میں ایک
جناب ہرنام صاحب نے مسئلہ خلافت و امامت پر ایک علمی بحث شروع کی جس کے سلسلے میں چند مہ
کے بعد خود مدیر نگار، جناب نیاز فتحپوری نے فروری سنہ ۳۶ء کے نمبر میں "مسئلہ خلافت و امامت میری
نظر سے" کے عنوان سے ایک طویل مضمون شائع کیا۔ اور مارچ سنہ ۳۶ء کے پرچے میں "خلافت و اما
کی سرخی سے ایک مختصر مضمون لکھا جس کی غرض صرف اتنی تھی کہ "اس سلسلے میں ان تمام مسائل کو ل
لیا جائے جو میرے (پچھلے مہینے کے) مضمون کو پڑھنے کے بعد معرض بحث میں آسکتے ہیں" مثال کے ط
ان مسائل کی ایک فہرست بھی دے دی اور اس کے بعد یہ لکھا کہ "(سنی اور شیعہ) ہر دو مذاہب کے
اہل نظر کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ نہایت سنجیدگی سے ان تمام مسائل پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار ف
اور جہاں تک ممکن ہو ان روایات سے استدلال نہ کریں جن کا تعلق صرف خوش عقیدگی سے ہے اور جو روایتاً قابل ق
جناب نیاز فتحپوری کی فرمائش کے پورے دس مہینے کے بعد "نگار" کے جنوری نمبر سنہ ۳۷ء میں
گم نام صاحب کا مضمون "مسئلہ خلافت و امامت ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے" کی سرخی کے ساتھ شائع
جس میں تقریباً نیاز صاحب کے تجویز کردہ ہر مسئلہ پر موصوف کے حسب منشا بحث کی گئی ہے جس کا انہوں
اسی مہینے کے ادارتی نوٹ میں اقرار کیا ہے۔

اسی زمانہ کے لگ بھگ سنہ ۱۳۵۵ھ میں "اسد" اخبار کے قائم نمبر میں سید العلماء جناب مو
سید علی نقی صاحب قبلہ دام ظلہ کا ایک گراں قدر مضمون "قیام امامت کی ضرورت" شائع ہوا۔ اس کی ماتحت
سرخی ہے "امامت کے بارھویں امام پر ختم ہو جانے کا سبب اور امام موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہ"
زیر نظر کتاب "خلافت و امامت حصہ سوم" انہیں دو مضمونوں کا مجموعہ ہے جناب سید العل
کا مضمون اتفاق سے جناب نیاز کے بعض مسائل کا حل بھی ہے اور آزاد خیال شیعہ کے مضمون کی رہ
سہی کمیوں کو بھی پورا کر دیتا ہے اسلئے اس بحث کے سلسلے میں اس کا بھی شائع کرنا مناسب سمجھا گیا۔

(خادم مشن) سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری (۳۱ اگست سنہ ۳۸ء)

گئی ہو۔

جہاں تک تاریخی بحث کا تعلق ہے معاملہ ختم ہو گیا اور محترم مدیر نگار نے جیسا کہ "ہر نام" صاحب نے اپنے آخری مضمون میں نگار کے تائیدی سکوت کے ساتھ اظہار فرمایا ہے۔ اس بحث کا آخری فیصلہ شیعوں کے حق میں کر دیا، یعنی اُنہوں نے تمام واقعات کی صحت کو تسلیم فرماتے ہوئے اُن کا نتیجہ یہی قرار دیا کہ حضرت رسول اکرمؐ حضرت علیؑ ہی کا خلیفہ و جانشین ہونا پسند فرماتے تھے۔ اور آپ نے اس کا بار بار اظہار بھی فرمایا۔

مگر آپ نے اپنے محاکمہ کے دامن وار اطراف میں کچھ ایسے مسائل کو بھی چھیڑ دیا جو خالص اعتقادی حیثیت رکھتے ہیں اور مارچ ۳۶ء کے پرچہ میں اسی محاکمہ کے پیش کردہ نتائج کی روشنی میں آپ نے چند سوالات بھی مرتب فرما کر شائع کیے جن کے جواب کے لیے آپ نے ہر دو مذاہب کے علماء و اہل نظر کو دعوت دی۔

"ہر نام" صاحب نے بھی "محاکمہ" کو دیکھنے کے بعد اپنا جو آخری بیان شائع کیا اس میدان بحث اور محاذ گفتگو بدل جانے پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کنارہ کشی کا اظہار کیا اور اب اس بحث کے لیے خاص شیعی جماعت کے ارباب علم سے تحریک کی کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کو پیش کریں۔ جناب

اور اتنی دلچسپی کے ساتھ کہ اس کا سلسلہ دو برس کے قریب عرصہ تک قائم رہے۔ اور پھر جنوری کے مخصوص نمبر کا ایک اچھا خاصہ حصہ اُس کی نذر کر دیا جائے۔

لطف یہ ہے کہ اس "سازِ بے آہنگ" کے چھیڑنے والے ایک غیر متعلق شخص متنازع فیہ مسئلہ کے ساتھ دور کا بھی رشتہ نہ رکھنے والے کوئی "ہرنام" صاحب ہیں جو اقراری "ہندو" ہیں جس کے بعد اُن کی نسبت کچھ اور خیال کرنے کی ضرورت نہیں اور جبکہ اسلام کی تعلیم بھی یہ ہے کہ "ماقال" کو دیکھو "من قال" پر نظر نہ ڈالو۔

"ہرنام" صاحب نے شروع شروع یہ بحث صرف تاریخی حیثیت تک محدود رکھی تھی، اور اعتقادی پہلوؤں پر کوئی توجہ نہیں کی تھی جس کا بقول ان کے ایک غیر مسلم شخص کو حق بھی نہیں ہے اس لیے اس بحث پر شیعی جماعت کے ذمہ دار حلقوں کی طرف سے خاموشی ہی مناسب تھی کیونکہ تاریخی بحث میں مذہبی جانبداری کا پہلو پیدا ہو جانا واقعات کی بے لاگ سراغ رسانی پر مضر اثر ڈالتا ہے۔

اس سے بڑھ کر بے لوث تحقیقات کیا ہو سکتی ہے کہ تحقیق کرنیوالا ایک غیر مسلم انسان "ہندو" اور فیصلہ کرنے والی ذات مدیر نگار کی سی (بقول خود) اصل مذہب کی ضرورت ہی کو مشکوک نگاہ سے دیکھنے

بعض اصحاب کا یہ خیال ہے کہ نگار میں اس مسئلہ کا اُٹھایا جانا ایک تجارت ہے اور صرف پرچہ کی گرم بازاری میں اضافہ منظور ہے ان اصحاب کا جواب بھی میری طرف سے یہی ہے کہ اگر کسی کی ذاتی تجارت کے سلسلہ میں کسی اہم مسئلہ کی تحقیق کا فرض انجام پا جائے تو کیا بُرا ہے ؟

بہر حال یہ دیکھ کر کہ نگار کے سوالات تشنۂ جوابات ہیں اور اُن کی تحقیق ہر حقیقت پرور انسان کا فرض ہے ، میں نے اس مضمون کی داغ بیل ڈالی ہے۔

مجھے اپنے بے نیاز القاب کرمفرما جناب نیازؔ سے بھی یہ نیاز مندانہ گزارش کرنا ہے کہ جہاں تک بحث کا صرف تاریخی پہلو تھا جناب کی غیر جانبدارانہ حیثیت مسلّم اور آپ کا بحیثیت حکم فیصلہ قابل قبول۔ لیکن اب اس بحث نے جو صورت اختیار کرلی ہے وہ مذہبی و اعتقادی ہے جس کے دلائل و اُصول کا بہت کچھ تعلق ما بعد الطبیعیاتی مبادی کے ساتھ ہے جن میں آپ خود مخصوص نظریات و معتقدات کے حامل ہیں جو اکثر و بیشتر عام مسلمانوں کے خلاف ہیں اور اُن اُصول و نظریات کے ماتحت خود آپ اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان ایک محاذ اختلاف قائم ہے۔

اگر آپ نے اس بحث کا فیصلہ اپنے اُصول کی بنیاد پر کرنا چاہا تو یہ ہرگز

نیاز نے بھی اس مضمون کی تذئیل میں "ہر دو مذاہب" کے بجائے "خصوصیت سے شیعی علماء" کی جانب دعوت کا رُخ پھیر دیا اور "نگار" کے جنوری نمبر کے اعلان میں یہ جملہ بھی شائع کر دیا کہ "مسئلہ خلافت پر ایک بسیط مضمون شائع کیا جائے گا جو شیعی نقطۂ نظر سے آخری حرف ہوگا۔" میں نہیں کہہ سکتا کہ شیعی علماء کے طبقہ میں اس دعوت پر توجہ کیوں نہیں کی گئی؟

ممکن ہے اس کا سبب مدیر "نگار" کی طرف سے "مایوسی" ہو جیسا کہ مدرسۃ الواعظین کے اخبار "الواعظ" کی متعدد اشاعتوں میں ایک طویل مقالہ شائع ہوا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مدیر نگار سنی ہیں اور انہوں نے جتنے سوالات قائم کئے ہیں وہ صرف سنیوں کی حمایت کے لیے

میں کم از کم اپنی "وسعتِ خیال" کے حدود میں جہاں تک مدیر نگار کے رویّہ پر غور کرتا ہوں مجھے اس "سوءِ ظن" کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی اور بالفرض اگر ایسا ہو بھی تو سوال کرنے والے کی نیّت سے جواب دینے والے کی زبان پر تو گرہ نہیں لگ سکتی۔ اُسے بہرحال اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کا موقع ہے اور سوال کو بیانِ حقیقت کا پیش خیمہ قرار دینے کا حق ہے۔

پہلی قسم میں حسب ذیل سوالات مندرج ہیں۔

۱۔ عصمت و عفت کا مفہوم کیا ہے، گناہ و خطا میں کوئی فرق ہے یا نہیں اور اگر لغزش و نسیان اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء و ائمہ کو غیر معصوم بنانے کے لیے کافی ہے تو کیوں؟

۲۔ انبیاء و ائمہ اگر غلطی یا لغزش سے پاک تھے تو اس کے عقلی یا نقلی دلائل کیا ہو سکتے ہیں؟

ان سوالوں کو میں نے مسئلہ خلافت کے مبادی میں اس لیے قرار دیا ہے کہ درحقیقت ان سوالوں کی بنیاد یوں ہی پڑی ہے۔ کہ خلافت جناب امیرؑ کے متعلق حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اظہارات و اعلانات سے استدلال پیش کیا گیا تھا جس کو اصل حقیقت کے اعتبار سے جناب مدیر نگار نے تسلیم فرمایا لیکن آنحضرت کے اعلانات کو حضرت علیؑ کے ثبوت حق خلافت کے لیے کافی قرار دینے میں اس بنا پر عذر فرمایا کہ خود رسولؐ سے بھی خطائے اجتہادی ممکن ہے اور اس لیے آپ نے جو اعلان فرمایا ممکن ہے وہ آپ کی ذاتی رائے کی بنیاد پر ہو لیکن درحقیقت مسلمانوں کے لیے مفید و نتیجہ خیز نہ ہو۔ اس لیے مسلمانوں کا اس پر عمل نہ کرنا حق بجانب قرار پا سکے۔

اب اگر رسولؐ سے کلیتاً یا بالخصوص اس مسئلہ میں خطائے اجتہادی کا امکان غلط قرار پا جائے تو حضرت علیؑ کی خلافت بلا فصل کا ثبوت بلا کسی

ایک غیر جانبدارانہ حکم کا فیصلہ قرار نہیں پا سکے گا۔ بے شک اگر اس بحث کا بحیثیت حکم فیصلہ کرنا ہے تو ضرورت ہے کہ مراحل ابتدائی میں آپ انہیں اُصول کو پیش نظر رکھیے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ اور مسلمہ ہیں اور جن میں شیعہ و سنی کی تفریق نہیں ہے اور اُن "اُصول موضوعہ" کو پیش نظر رکھ کر یہ دیکھیے کہ کون فریق ٹھیک کہہ رہا ہے۔

درصورتیکہ آپ اُن مبادی و اُصول سے الگ ہو کر خود اپنے معتقدات کے اوپر بحث کرنا چاہتے ہیں تو اُسے محاکمہ کا درجہ عطا نہیں کیا جا سکے گا بلکہ ایک فریق بن کر دلائل کے ذریعہ سے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کا فرض ادا ہو گا جو ہر انسان کا حق ہے۔

سوالات کی تقسیم

جہاں تک سوالات کا تعلق ہے میں ان کو تین حصّوں میں منقسم کر سکتا ہوں۔

نمبر ا۔ مسئلہ خلافت کے مبادی و مقدمات۔
نمبر ۲۔ نفس مسئلہ خلافت۔
نمبر ۳۔ مسئلہ خلافت کے فروع و جزئیات۔

۲۔ قیام امامت کی ضرورت کیا ہے اور صرف اہلبیت میں اس سلسلہ کا قائم رہنا کیوں ضروری ہے؟

۳۔ امامت کے بارھویں امام پر ختم ہو جانے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟

۴۔ جو سلسلۂ امامت دوسرے شیعی فرقوں کے نزدیک صحیح ہے اس کو غلط قرار دینے کے لیے اثنا عشری جماعت کیا دلائل اپنے پاس رکھتی ہے۔

۵۔ امام مستور یا مہدی موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہ۔

میں نے ان سوالوں کو مسئلہ خلافت کے فروع و جزئیات میں اس لیے مندرج کیا ہے کہ اصل بحث جیسا کہ ہر نام صاحب کے افتتاحی مضمون سے ظاہر ہے اور جس کا "ہر نام" نے یزمی صاحب کے جواب میں صراحتہً اظہار بھی کیا ہے صرف حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلا فصل کے متعلق ہے یعنی سوال یہ درپیش ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد حضرت کا جانشین کس کو تسلیم کیا جائے؟

اور اس لیے "مسئلہ خلافت و امامت" میں درحقیقت اسی کو یکسوئی کے ساتھ طے کرنا چاہیے۔

حضرت علیؑ کے بعد پھر یہ سلسلہ کس طرح چلے؟ خلافت کو حسنی شاخ میں تسلیم کیا جائے یا حسینی شاخ میں؟

اس سلسلہ کو بارہ کی تعداد پر ختم ہو جانا چاہیے یا نہیں؟

وغدغہ کے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔

دوسری قسم میں حسب ذیل سوالات ہیں :۔

۱۔ وصایت جناب امیرؑ ثابت کرنے کے لیے حضرات شیعہ کیا نصوص قطعیہ پیش کرتے ہیں۔

۲۔ مسئلہ خلافت کو اصل مذہب اسلام سے کیا تعلق ہے ؟

۳۔ اسلام نے ہیئت اجتماعی کا کیا اصول پیش کیا ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے نیابت و خلافت کا سلسلہ نامزدگی کے ذریعہ سے صحیح تسلیم کرنا اور کسی ایک خاندان کے لیے مخصوص سمجھنا درست ہو سکتا ہے یا نہیں ؟

۴۔ ہر دو فریق کی روایات پر سیاسی ماحول کا کوئی اثر پڑا یا نہیں اگر پڑا تو کیا ؟

چوتھے سوال کو نفس مسئلہ خلافت سے متعلق میں نے اس لیے قرار دیا کہ خود انہیں روایات میں جو مسئلہ وصایت کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں یہ شبہہ پیدا ہونے کا امکان ہے کہ ان پر سیاسی ماحول کا کچھ اثر پڑا ہے یا نہیں اور اس لیے وہ معتبر سمجھی جاسکتی ہیں یا نہیں ؟

تیسری قسم میں ذیل کے سوالات داخل ہیں :۔

۱۔ کیا انبیاء و ائمہ مستقبل کے حالات سے باخبر تھے۔ اگر تھے تو اس کا کیا ثبوت ہے ؟

متعلق ہوگا اور آخری قسم کے سوالات کی بحث کو اُس وقت کے لیے اُٹھا رکھا جائے گا جب حضرت علیؑ کی خلافت کا مسئلہ بالکل طے ہو جائے۔ پھر میں خود اپنے مقام پر سنجیدگی کے ساتھ غور کروں گا کہ اس سلسلہ کو آگے کس طرح بڑھایا جائے؟

پہلا سوال

عصمت وعفت کا مفہوم کیا ہے، گناہ اور خطا میں کوئی فرق ہے یا نہیں اور اگر لغزش ونسیان، اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء وآئمہ کو غیر معصوم بنانے کے لیے کافی ہے تو کیوں؟

"عصمت" کے لغوی معنی تو "حفاظت" کے ہیں اور اسی معنی کے لحاظ سے علم کلام کی اصطلاح میں انبیاء وآئمہ کے لیے اس کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایک خاص طرح کی نفسانی کمزوریوں سے لازمی طور پر ان کے محفوظ ہونے کے معنی میں۔

چونکہ "حفاظت" کے معنی خود "متعلق" کے طالب ہیں یعنی کس شے سے حفاظت؟ اس لیے اس کے مفہوم اصطلاحی میں قیود عائد کرنا یعنی اُن نفسانی کمزوریوں کی حد مقرر کرنا جن سے انبیاء وآئمہ کو لازمی طور پر محفوظ ہونا

وجودِ امام سے کسی زمانہ کو خالی سمجھا جائے یا نہیں؟
بارھویں نمبر پر حضرت امام مستور یا مہدی موعود کو تسلیم کیا جائے
یا نہیں؟ یہ تمام باتیں خارج از مبحث قرار پاتی ہیں۔

حضرت علیؑ کی خلافت کے مسئلہ میں جہاں محاذِ اختلاف صرف شیعہ اور سنی کے درمیان ہے ایسے مباحث کا چھیڑ دیا جانا جن میں محاذِ اختلاف بالکل جداگانہ ہو جاتا ہے سلسلۂ گفتگو کو "ژولیدہ" اور بحث کو پریشان بنانے کا باعث ہے جو معاملہ فہمی کے خلاف ہے۔

فرض کیجیے کہ کوئی "آزاد خیال مفکر" حضرت رسولؐ کے بعد حضرت علیؑ کو خلیفۂ بلا فصل تسلیم کرتا ہے لیکن پھر بھی اُن تمام معتقدات کو تسلیم نہیں کرتا جو اثنا عشری جماعت نے مذہبی حیثیت سے ضروری قرار دئے ہیں، تو کیا ایسے شخص کے عقل و دماغ پر پہرہ بٹھایا جا سکتا ہے اور اُسے مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت علیؑ کو خلیفۂ بلا فصل تسلیم کرے تو بس آخر تک اس سلسلہ کو اسی طرح سے صحیح سمجھ لے جو اثنا عشری جماعت نے قائم کیا ہے جب ایسا نہیں تو حضرت علیؑ کی خلافت ایسے صاف اور واضح مسئلہ میں کیوں ان غیر متعلق باتوں کو چھیڑ کر بحث کو پراگندہ بنایا جائے؟

اس لیے میں اپنے زیرِ تحریر مقالہ میں ہرگز اس "خطائے اجتہادی" کے ارتکاب پر آمادہ نہیں ہوں۔ میرا جواب صرف پہلی دو قسم کے سوالات سے

بلکہ ہر شخص کو ایک حد تک غیر معصوم بنانے کے لیے کافی ہے یعنی یہ کہ وہ "معصوم عن الخطا" نہیں ہیں اور ایک حد تک یقیناً غیر معصوم بنانے کے لیے ناکافی ہے یعنی لغزش و نسیان کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ وہ "معصوم عن الذنب" بھی نہ ہوں لہٰذا سوال کے الفاظ یوں ہوتے تو بہتر تھا کہ اگر لغزش و نسیان اجتہادی غلطی سے بھی انبیاء و آئمہ کو معصوم ہونے کی ضرورت ہے تو کیوں؟ اس طرح بحث اپنے اُس راستہ پر آجائے گی جو اُس کے لیے ہونا چاہیے۔

مگر اس صورت میں سوال نمبر ۲ کے ساتھ اس سوال کا کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔ اور اس لیے ان دونوں سوالوں کا الگ الگ مقرر کیا جانا صرف مجیب کی نکتہ رسی کا امتحان ہو سکتا ہے اور کچھ نہیں۔

بہر حال موجودہ صورت میں جبکہ سوال نمبر ۲ بھی موجود ہے جس میں مجھ کو انبیاء و آئمہ کے غلطی یا لغزش سے پاک ہونے کے دلائل لکھنا ضروری ہیں میں اس سوال کے جواب میں گناہ اور خطا دونوں سے انبیاء کی عصمت کے مفہوم کو واضح کرنے پر اکتفا کروں گا اور دوسرے جزو کو "یعنی یہ ضروری ہے تو کیوں؟" دوسرے سوال کے جواب کے لیے اُٹھا رکھوں گا۔

اس کے لیے سب سے پہلے جناب نیاز کی وہ عبارت نقل کرتا ہوں جو آپ نے اسلام کے پیش کردہ معیار نبوت کے متعلق اپنے محاکمہ (نگار فروری ۱۹۳۶ء) میں تحریر فرمائی ہے پھر اُس پر ضروری تبصرہ کروں گا۔

چاہیے خود عقلی بحث کا تابع ہے۔ یعنی یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کون کون باتیں ایک نبیؑ و امامؑ کی شان نبوت و امامت کے خلاف اور اس مقصد کے ہیں جس کے لیے نبیؑ و امامؑ کا تقرر ہوتا ہے، بس انہیں تمام باتوں سے حفاظت "عصمت" کے اس مفہوم کی تشکیل کرے گی جو اصطلاحی حیثیت سے نبیؑ و امامؑ کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔

رہ گئی "عفت" اس کے معنی "پرہیزگاری" اور "پارسائی" کے ہیں اور وہ علم اخلاق کی اصطلاح میں قوت شہویہ کے اعتدال کا نام ہے جو اپنے مکمل معیار کی حیثیت سے "عصمت" کا ایک شعبہ قرار پا سکتا ہے اس کی پوری تفسیر نہیں جیسا کہ سوال کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔

"گناہ" اور "خطا" میں بے شک فرق ہے یعنی "گناہ" میں ارادہ اور ضمیر کا تعلق ضرور ہے لیکن "خطا" لغزش، اجتہادی غلطی، نسیان اور بھول چوک کو بھی کہتے ہیں، مگر یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ عصمت جو نبیؑ و امامؑ کے لیے عقلی فیصلہ کی بنا پر ضروری ہے وہ صرف "گناہ" سے عصمت ہے یا "غلطی اور بھول چوک" سے عصمت بھی ضروری ہے اسی بنا پر سوال کے ان الفاظ سے مجھے اختلاف ہے کہ اگر "لغزش و نسیان" اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء و آئمہ کو غیر معصوم بنانے کے لیے کافی ہے تو کیوں؟ اس لیے کہ لغزش و نسیان صرف انبیاء و آئمہ کو نہیں

ضبطِ نفس کی تعریف کرتے ہیں لیکن اگر ہم یہ جان جائیں کہ اس میں قدرت کی طرف سے یہ مادہ ہی نہیں پایا جاتا اور وہ فطرتاً ناکارہ پیدا ہوا ہے تو پھر ہم بجائے تعریف کے اس کی حقارت کرنے لگتے ہیں۔ الغرض ایک انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ باوجود گناہ پہ قدرت رکھنے کے اس سے باز آئے، وہ جھوٹ بول سکتا ہو لیکن نہ بولے، وہ غصہ کر سکتا ہو لیکن نہ کرے، ماحول سے متاثر ہو سکتا ہو لیکن نہ ہو۔ اسی پہ ایک نبیؑ کے خصوصیات کا زیادہ وسیع پیمانہ پہ قیاس کر لیجیے۔

اگر ہم یہ مان لیں کہ نبیؑ فطرۃً معصوم پیدا ہوا ہے تو اس کی عصمت کوئی قابلِ تعریف بات نہیں، اگر وہ غیب کی باتیں جان لیتا ہے تو اس کی فراست و پیش بینی بے معنی ہے، اگر فرشتے اس کی مدد کرتے ہیں تو اس کی کامیابیاں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں، اگر اس سے کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی تو اس کی سلامت روی ہیچ ہے، ایک نبیؑ کو دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں امتیاز اگر حاصل ہے تو صرف یہ کہ باوجود ان تمام جذبات رکھنے کے جو تمام لوگوں میں پائے جاتے ہیں ان کے ضبط پر دوسرے انسانوں سے زیادہ قادر ہے اور وہ دوسرے انسانوں کی طرح

آپ تحریر فرماتے ہیں :-

"انسان کو دیگر مخلوقات کے لحاظ سے اشرف المخلوقات صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کو عقل و فراست عطا ہوئی ہے اور وہ اپنے جذبات حیوانی سے مغلوب نہیں ہو سکتا اگر وہ چاہے بالکل اسی طرح ایک نبیؑ دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں صرف یہ شرف رکھتا ہے کہ اس میں وہ تمام قوتیں جو ایک انسان کو حیوان سے ممیز کرتی ہیں زیادہ تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہیں اور وہ باوجود تمام جذبات حیوانی رکھنے کے ان کے ضبط پر غیر معمولی قدرت رکھتا ہے۔

ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں جو حد درجہ مسکین و غریب ہے، جو کبھی کسی سے انتقام نہیں لیتا، جو ہر شخص کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے اور ہم اس کی صلاحیت نفس کی تعریف کرتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ وہ غیر معمولی ضبط سے کام لے کر اپنے جذبات حیوانی پر قابو رکھتا ہے لیکن اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ قدرتاً وہ حد درجہ بے حس واقع ہوا ہے تو ہم بجائے تعریف کرنے کے اس کو بزدل بے غیرت کہیں گے۔

ایک شخص حد درجہ عفت مآب و پاک باز ہے اور ہم اس کے

توہین کرنا ہے۔
نبیؐ آخر الزماں سے قبل نبوت کا جو مفہوم لوگوں کے ذہن نشین تھا وہ یہ تھا کہ "رسولؐ" نوع انسانی سے علیحدہ کوئی چیز ہے اور اس کا تعلق فرشتوں سے ہے۔ اس کی تردید رسولؐ اللہ کی زبان سے یوں کی گئی۔

" قل لو کان فی الارض ملائکۃ یمشون مطمئنین لنزلنا علیھم من السماء ملکا رسولا۔" (سورہ بنی اسرائیل آیت ۹۵) یعنی اگر زمین میں بجائے انسانوں کے فرشتوں کی آبادی ہوتی تو ہم کسی فرشتہ ہی کو رسول بنا کر بھیجتے۔
اسی طرح سورہ کہف (آیت ۱۱۰) میں رسولؐ اللہ کی انسانی حیثیت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:۔

" قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی انما الھکم الٰہ واحد۔" یعنی اسے رسولؐ کہہ دے کہ میں تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ خدا مجھے تمہیں صداقت کی تعلیم دینے کی ہدایت کرتا ہے۔
سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۹۳ میں " ھل کنت الا بشرا رسولا" کہہ کر اس کی اور زیادہ وضاحت کر دی جاتی ہے۔

سوچتا ہے لیکن بہت غائر نگاہ سے، وہ مخالف اور متقابل قوتوں سے متاثر ہوتا ہے لیکن بہت کم، وہ کسی غایت تک پہنچنے کے لیے ان ہی اسباب و دلائل کو سامنے رکھتا ہے جو دوسروں کے سامنے ہیں اور اکثر صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے۔

الغرض وہ ہماری طرح ایک انسان ہے لیکن بلند ترین سطح کا اور انسانی فراست سے جو غلطی یا لغزش اس دنیا میں ہو سکتی ہے وہ اس سے بھی ممکن ہے لیکن بہت کم، وہ اپنی نیت کے لحاظ سے اپنے مقاصد کے نقطۂ نظر سے یقیناً ایک معصوم انسان ہے لیکن اپنی تدابیر اپنی فہم و دانش کے لحاظ سے اس کاروبار عالم میں وہ کبھی کبھی اجتہادی غلطی بھی کر سکتا ہے اور یہی وہ مفہوم نبوت کا تھا جسے سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا اور جس کو سامنے رکھ کر ہم رسول اللہ کی غیر معمولی عظمت تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ممکن ہے مسلمانوں کی جماعت نبوت کے اس مفہوم کو سن کر متعجب ہو علی الخصوص حضرات شیعہ، جو نہ صرف رسول اللہ بلکہ اہل بیت کے تمام افراد کو معصوم جانتے ہیں لیکن کیا کروں کلام پاک سے نبوت کا مفہوم میری سمجھ میں یہی آتا ہے اور اس سے ہٹ کر "پیدائشی معصومیت" سے نبی کو متصف کرنا میرے نزدیک منصب نبوت کی

ذنبک" یہاں بھی وہی لفظ ذنب موجود ہے۔
ایک بار رسول اللہ نے کسی اندھے کی بات نہ سنی اور اس سے منہ
پھیر لیا، اس پر آپ کو اس طرح تنبیہ کی گئی "عبس وتولیٰ ۔ ان
جاءہ الاعمیٰ۔" سورۂ عبس آیت ۱۔۲۔۳۔
سورۂ برأت (آیت ۴۳) میں رسول اللہ سے مطالبہ کیا جاتا ہے
کہ "عفا اللہ عنک لم اذنت لھم حتی یتبین لک الذین
صدقوا وتعلم الکاذبین۔" کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے بعض
جنگوں میں رسول اللہ کا ساتھ نہ دیا تھا لیکن رسول اللہ نے ان کو پھر
شمولِ جنگ کی اجازت دے دی تھی، اس پر آپ سے کہا گیا کہ جب تک
سچے جھوٹوں کی تفریق نہ ہوئی تھی۔ کیوں انہیں اجازت دی گئی" سورہ
انعام کی آیت ۶۸ سے یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ آپ سے وہ
نسیان بھی سرزد ہو سکتا تھا جسے عام طور پر شیطان سے منسوب
کیا جاتا ہے۔
آیات مذکورہ بالا کے مطالعہ سے دو باتیں بخوبی واضح ہو جاتی
ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ کی ذات لغزش، غلطی، نسیان یا بھول
چوک سے مستثنیٰ نہ تھی، اور دوسرے یہ کہ آپ کو آئندہ کا کوئی
حال معلوم نہ تھا، ممکن ہے بعض حضرات اسے منصب نبوت کی

تقریباً ایک صفحہ کی عبارت کے بعد جو غیب دانی کے مسئلہ سے
بہ ہماری بحث سے خارج، تحریر ہوتا ہے۔
نبیؐ کے متعلق یہ بھی عام اعتقاد پایا جاتا ہے کہ اس سے کوئی غلطی
سرزد نہیں ہو سکتی یا یہ کہ وہ خطا و نسیان سے مبرا ہے لیکن
کلام مجید سے اس کی بھی تردید ہوتی ہے۔
سورۂ سبا کی آیت ۴۹ میں رسول اللہؐ سے ارشاد ہوتا ہے "قل
ان ضللت فانما اضل علیٰ نفسی و ان اهتدیت فبما
یوحیٰ الیّ ربی انه سمیع قریب" (یعنی کہہ دو کہ اگر مجھ سے کوئی
لغزش ہوتی ہے تو اس کا ذمہ دار میں ہوں، اور اگر سیدھی راہ
اختیار کرتا ہوں تو وہ خدا کی ہدایت ہے۔)
سورۂ مومن آیت ۵۵ میں ایک جگہ رسول اللہ سے خطاب کیا گیا
ہے کہ "استغفر لذنبك و سبح بحمد ربك" (اپنی غلطی
سے توبہ کر اور خدا کی حمد بیان کر)
سورۂ محمدؐ آیت ۱۹ میں پھر "و استغفر لذنبك و للمومنین
و المومنات" کے الفاظ ارشاد ہوتے ہیں۔
سورۂ فتح کی آیت ۱-۲ میں ارشاد ہوتا ہے۔
"انا فتحنا لك فتحا مبینا لیغفر لك الله ما تقدم من

کے لیے مضمون لکھنے کے سلسلہ میں اس امر میں پس و پیش ہوتا کہ وہ خود جناب نیاز کے فیصلہ ہی کو محلِ بحث قرار دے کر نقد و تبصرہ سے کام لے لیکن چونکہ میں ممدوح کی وسیع الخیالی کا دل سے معتقد ہو چکا ہوں اور دیکھ چکا ہوں کہ انہوں نے "ہر نام" کے آخری مضمون کو جس میں محاکمہ کے بعض اجزا کی تردید بھی کی گئی تھی بغیر کسی "ناگواری" کے جو "تنگ ظرف" افراد کا شیوہ ہے اور بلا کسی اظہارِ اختلاف کے بلکہ ایک طرح کی تائیدی نوٹ کے ساتھ شائع کر دیا اور پھر جبکہ میں دیکھتا ہوں کہ ممدوح نے محاکمہ میں ان خیالات کے اظہار کے بعد پھر اپنے سوال میں اس مسئلہ کو زیر بحث قرار دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اہل نظر کو خود اپنے خیالات کے نقد و موازنہ کا موقع دے رہے ہیں، اس لیے ہرگز مجھے کوئی پس و پیش نہیں ہے۔ اس میں کہ خود جناب نیاز کے رسالہ میں ان کے خیالات پر سخت سے سخت گرفتیں کروں کیونکہ جو شخص ایک نبی و رسولؐ کی ذات کو خطائے اجتہادی سے مستثنیٰ نہیں سمجھتا وہ اپنی ذات کے لیے اس سے مستثنیٰ ہونے کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

جہاں تک عبارت کے ابتدائی حصہ کا تعلق ہے، یہ کہ "عصمت سلب اختیارات" کا نام نہیں ہے اور نہ قوائے معصیت کے مفقود ہونے کا بلکہ یہی کہ باوجود تمام جذبات حیوانی کے ان کے ضبط پر غیر معمولی قدرت رکھتا ہو اور ایک انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ باوجود گناہ پر قدرت رکھنے کے اس سے باز آ رہے۔"

یہ ایسی بات ہے۔ جس سے سنجیدہ اور محقق علمائے اسلام و متکلمین شیعہ کو

توہین سمجھیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ رسول اللہؐ کی حقیقی عظمت و جلالت صرف اسی طرح ثابت ہو سکتی ہے کہ پہلے ان کو ایک انسان اور پھر نبیؐ سمجھا جائے۔

میں کبھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہؐ کسی معصیت یا گناہ میں مبتلا ہو سکتے تھے کیونکہ گناہ کا تعلق انسان کے ارادے اور خرابیٔ ضمیر سے ہے اور اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک نیت و ارادہ کا تعلق ہے ایک رسولؐ کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا، لیکن گناہ کے علاوہ ایک چیز اور ہے جسے انسانی لغزش، اجتہادی غلطی، نسیان اور بھول چوک کہتے ہیں اور اس کا امکان ہر وقت ہر انسان سے ہے یہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہؐ کی ذات مرکز تھی روحانی و مذہبی تعلیم کی بھی اور سیاسی رہنمائی کی بھی یا بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ جس حد تک مذہب کا تعلق تھا آپ کی ہر تعلیم وحی و الہام کے ماتحت ہوتی تھی، اور اس میں کسی لغزش کا امکان نہ تھا، لیکن آپ کی سیاسی زندگی میں اس کا امکان تھا کہ آپ سے کبھی کوئی فروگذاشت ہو جائے یا کوئی فیصلہ آپ ایسا کریں جو مناسب نہ ہو۔"

یہ عبارت تمام و کمال بغیر اندیشۂ طول کلام کے اس لیے نقل کی گئی اس کے تمام اجزاء قارئین کرام کے پیش نظر رہیں۔ کوئی اور ہوتا تو اسے خو

حیوانات سب سے انسان کو اشرف قرار دیا۔ دوسری طرف صنف
ملائکہ سے بڑھا دیا ــــ مَلَک، وہ بے شک بلند مرتبہ ہستی ہے، رفیع
المنزلت وجود ہے۔ بھلا کیا حق مجھ کو کہ میں ملائکہ کی منزل کو پست کہوں
عالم بالا کے رہنے والے، سدرہ پر منزل رکھنے والے، جوار حضرت احدیت
میں بسنے والے، ان کی منزلت کو میں پست کہوں یہ ناممکن ہے، بہت
بلند، بہت رفیع المرتبہ، بہت اعلےٰ منزلت، مگر میں نے عرض کیا "خود
اختیاری ترقی کی صلاحیت" اختیار کے معنی ہمیشہ دو پہلوؤں کے
طالب، وجود اور عدم، ہست و نیست، فعل و ترک، ملائکہ بہت بلند
ہیں۔ لیکن اُن کی بلندی محل، مرتبہ و منزل کی رفعت ظاہری اعتبار سے
ہمارے لیے ویسی ہی ہے جیسے معمار نے یہ عمارت بنائی، اس کا
کنگرہ وہاں رکھا، اینٹیں یہاں رکھیں، ہے ضرور وہ کنگرہ بلند مگر
معمار نے وہاں رکھا ہے ــــ وہ ہے بلند، لیکن تعریف ویسی ہی
کروں گا جیسی موتی کی آب و تاب کی۔ بطور ثنا و ستائش کے میں
کمال کا اعتراف کروں۔ یہ ناممکن ہے اس لیے کہ بنانے والے نے
بلند ہی رکھا۔ اختیاری حیثیت سے بلند ہوتا تب میں تعریف کرتا۔
وہاں کی یہ بلندی رمز ہے انسان سے اُس کے پست درجہ پر ہونے کی
اُس کی پاک و مقدس ذات ہے اس کی ذات میں عصیاں کا وجود

کوئی اختلاف نہیں ہے اور عصمت کا یہی مفہوم ہے جس کے لحاظ سے وہ ایک
و امام کے لیے معصوم ہونا ضروری سمجھتے ہیں اور اسی لیے ان کا قول ہے کہ نبی
امام فرشتوں سے افضل ہوتا ہے کہ فرشتہ (وہ کوئی وجود حقیقی رکھتا ہو یا
لیکن جو مفہوم اس کا قرار دیا گیا ہے اُس کے لحاظ سے) وہ مخلوق ہے جس میں
معصیت خلق ہی نہیں ہوتے اس لیے وہ اگر گناہ نہیں کرتا تو کوئی قابلِ تعریف
نہیں، لیکن معصوم باوجود گناہ کی تمام قوتیں رکھنے کے پھر بھی گناہ نہیں کرتا
وہ فرشتہ کے درجہ سے بلند درجہ رکھتا ہے اس کا نتیجہ وہی ہوا جو مدیر نگار نے
بایں الفاظ تحریر فرمایا ہے کہ :-

"پیدائشی معصومیت سے نبی کو متصف کرنا میرے نزدیک منصب
نبوت کی توہین کرنا ہے"

اس خیال میں کوئی ایسی ندرت نہیں ہے جس کو سن کر مسلمانوں کی عموماً
اور علی الخصوص شیعہ متعجب ہوں۔ سند کے لیے بطور ایک ذمہ دارانہ تصدیق کے
جناب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب کی عبارت نقل کی جاتی ہے جو "اسلام کا
حکیمانہ نظام زندگی" شائع کردہ "امامیہ مشن" لکھنؤ کے صفحہ ۳۸ اور ۴۰ پر مندرج ہے
اس میں صاف صاف اسی نظریہ کی تلقین موجود ہے۔

"خود اختیاری حیثیت سے علمی و عملی ترقی کرنا یہ انسان کا جوہر خاص ہے
—— یہی وہ چیز ہے کہ جس نے ایک طرف تو جمادات، نباتات

ڈھیرے بھیڑے ہوئے صرف عطیہ کے طور پر اس کو میں نے ڈائیٹر کر دیا
کیا۔ وہ ملک عصمت ہے اور یہ انسان کی طاعت ہے۔"

نبیؐ و رسولؐ کے متعلق ہرگز یہ خیال درست نہیں کہ اس میں خصوصیات انسانی کو مفقود ہونا چاہیے بلکہ درحقیقت اس میں خصوصیات انسانی کو پایۂ تکمیل پر ہونا چاہیے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ "انسان کامل" کہے جانے کا مستحق ہو اور مدیر "نگار" کے الفاظ میں "وہ ہماری طرح ایک انسان ہو لیکن بلند ترین سطح کا۔"

مگر خصوصیات انسانی کی تعیین میں اکثر دھوکا ہوتا ہے۔

پست درجہ کے افراد کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں واقفیت ہے تو اس کے ساتھ بہت سی باتوں سے ناواقفیت۔ سلامت روی ہے تو اُس کے ساتھ کج روی۔ تحفظ و تذکر ہے تو اس کے ساتھ سہو و نسیان ــــ اصابت رائے ہے تو اس کے ساتھ غلطی۔ یعنی محاسن کے ساتھ معائب کی شرکت اور کمالات کے ساتھ نقائص کی آمیزش ہے۔

"خصوصیات انسانی" کے تحت میں اگر نقائص کا شمار کیا گیا جن کے ساتھ اُن محاسن کا دامن آلودہ ہے تو "خصوصیات انسانی" کے پایۂ تکمیل پر ہونے یا "انسان کامل" کے مفہوم پیدا ہونے کی صورت یہ ہوگی کہ سب سے زیادہ جاہل، سب سے زیادہ کج رو، سب سے زیادہ بھلکڑ، اور سب سے زیادہ غلطی کرنے والا ہو۔
لیکن "خصوصیاتِ انسانی" اگر نام ہے اُس کمال کے پہلو کا جو پست

نہیں ہے لیکن بایں معنی کہ قوت عصیاں خلق ہی نہیں ہوئی۔ طاقت گناہ پیدا ہی نہیں کی گئی۔ صاف و شفاف جس کے دامن پر کوئی دھبّا نہیں، بالکل پاک و منزہ، لیکن انسان کے مقابلہ میں ملک ناز کر سکے؟ ناممکن ہے۔ تمام ملائکہ بے شک بہت بڑے درجہ پر۔ بہت منزہ اور معصوم لیکن ان کی عصمت خود اختیاری نہیں ہے۔ پیدا کئے گئے ہیں معصوم۔ رہیں معصوم۔ مگر انسان متحارب قوتوں کا مالک، ایک جنگ ہے جو اس مختصر سی دنیائے جسم انسانی میں برپا رہتی ہے۔ ایک طرف نفس امارہ کی طاقتیں ہیں ـــــ وہ اپنی طرف لے جانا چاہتی ہیں۔ ایک طرف عقل کا لشکر ہے وہ اپنی سی چاہتا ہے کہ کر کے رہے۔ یہ تصادم ہے۔ ان متحارب طاقتوں میں انسان رکھا گیا ہے کہ وہ اپنی نظر سے امتیاز کر کے ساتھ دے۔ اب اگر انسان نے ان تمام متحارب طاقتوں کو دیکھ بھال کر ایک کا ساتھ دیا دوسرے سے بیزاری اختیار کی تو کیا کہنا۔ پھر تو لڑ بھڑ کر فتح کر کے مظفر یاب ہوا ہے راستہ چلتے کوئی مال و دولت ہاتھ نہیں آ گیا ہے، بلکہ اپنی قوت بازو سے جنگ کر کے فتح و ظفر حاصل کر کے ملک طاعت پر قبضہ کیا ہے۔ یہ انسان ہے۔ یہ ملک کے سامنے آتا ہے فتحمندی کا نشان سر پہ لہراتا ہوا آتا ہے۔ ملک سے کہتا ہے۔ جو ملک تم کو دیا گیا تھا بغیر

کیونکہ قرار پائے گی بلکہ نتیجہ یہی قرار پائے گا کہ وہ ایک ایسی ہستی ہے جس میں خصوصیات انسانی اپنے پورے درجہ کمال پر پائے جاتے ہیں اس لیے وہ نقائص بالکل فنا ہو گئے ہیں اور دوسری لفظوں میں وہ ایک انسان ہے لیکن بلند ترین سطح کا۔

اس کے بعد پھر آخر انسانیت کا لازمہ یہ کیوں قرار دیا جائے کہ اسے غلطی ضرور کرنا چاہیے۔ اسے بے راہ روی میں ضرور مبتلا ہونا چاہیے۔ اسے اپنی خواہشوں کی رو میں کبھی کبھی ضرور بہنا چاہیے ورنہ وہ انسان نہیں سمجھا جائے گا۔

پھر یہ دیکھیے کہ جذبات کی پیروی کرنا جس کا نام ہے گناہ، تحفظ و تذکر میں کوتاہی ہونا جس کا نام ہے سہو و نسیان غور و خوض میں صحیح نتیجہ پر نہ پہنچنا جس کا نام ہے غلطی اور خطاء اجتہادی یہ سب ایک ہی سطح کے نقائص نہیں ہیں "انسانی کمزوری" کے نام سے یاد کرکے عام طور سے انسانیت کی جانب منسوب کیا جاتا ہے اگر "انسانیت" ان ہی نقائص کے وجود کے ساتھ وابستہ ہے کہ کچھ نہ کچھ ان کی جنس انسان میں ضرور ہونا چاہیے ورنہ وہ انسانیت سے خارج ہے تو پھر ان میں تفریق کیوں کہ بعض تو نبی میں بالکل مفقود فرض کی جائیں اور بعض کو کم درجہ پر تسلیم کیا جائے؟

آخر یہ کس لیے کہ گناہ تو رسول سے بالکل نہیں ہوتا اور غلطی یا لغزش جو انسانی فراست سے اس دنیا میں ہو سکتی ہے وہ اس سے ممکن ہے لیکن بہت کم۔

افراد میں ان نقائص کے ساتھ آمیختہ ہے تو خصوصیات انسانی کی تکمیل اور انسان کامل کی امتیازی حیثیت یہ ہوگی کہ زائد سے زائد واقف کار، زائد سے زائد سلامت رو، زائد سے زائد باہوش اور زائد سے زائد صائب الرائے ہو۔

غالباً انسانی کمال کی بلند حیثیت کو کوئی شخص پہلی صورت کے ساتھ وابستہ نہیں قرار دیتا اور اسی لیے جناب نیاز بھی باوجود اس کہنے کے کہ "وہ ایک نبی کی شان یہ ہے کہ اس میں انسانی قوتیں زیادہ تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہوں" اور یہ کہ "وہ ایک انسان ہے لیکن بلند ترین سطح کا" نبی کے لیے اس کی ضرورت قرار دیتے ہیں کہ وہ تمام دوسرے انسانوں سے زیادہ ضبط نفس پر قادر ہے سب سے زیادہ غائر نگاہ سے سوچتا ہے۔ بہت کم مخالف و مقابل قوتوں سے متاثر ہوتا ہے اور غلطی بہت کم کرتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانی خصوصیات کا کمال ان ہی محاسن کی تکمیل کے ساتھ وابستہ قرار دیتے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ نقائص "انسانی خصوصیات" کا جزو نہیں بلکہ ان کے ساتھ ایک متضاد حیثیت رکھتے ہیں، جو ان خصوصیات کے پست اور ناقص درجہ میں ہونے کی بنا پر کسی حد تک پائے جاتے ہیں، اور جتنی خصوصیات انسانی کی تکمیل زیادہ ہو اتنے ہی یہ نقائص گھٹتے چلے جاتے ہیں پھر اگر کوئی ایسی ہستی فرض کی جائے جس میں یہ نقائص موجود ہی نہ ہوں تو وہ ایک "غیر انسانی ہستی" یا انسانی خصوصیات سے معرا ذات"

ہوئی بلکہ انسانیت میں بلندی پیدا ہوئی تو اس کے معدوم ہو جانے سے انسانیت مفقود کیونکر ہو گی بلکہ وہ بلند ترین سطح پہ پہنچ جائے گی جو حقیقتاً نبوت کا اصلی معیار ہے

"نہ کرنے" اور "نہ کر سکنے" کے لفظی اُلٹ پھیروں سے حقیقت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی مگر میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ "عصمت" بایں معنی کسی نہ کسی درجہ تک دنیا کے ہر شعبہ میں کارفرما ہے۔

یونیورسٹی اور کالجوں کے امتحانات ایک لڑکا بہت غلطیاں کرتا ہے۔ فیل ہو جاتا ہے۔ ایک ذہین ذکی لڑکا ہر درجہ میں کبھی فرسٹ ڈویژن سے کم معیار کے نمبر پاتا ہی نہیں، بے شک کہا جائے گا کہ یہ ذہین لڑکا کبھی فیل نہیں ہو سکتا اور کبھی غلط پرچہ نہیں لکھ سکتا۔

ایک حاذق طبیب کبھی نسخہ غلط نہیں لکھ سکتا، ایک ماہر وکیل کبھی بحث میں غلطی نہیں کر سکتا، ایک کامل قانون داں جج کبھی فیصلہ غلط نہیں کر سکتا ایک کامل زباں داں کبھی محاورہ کی غلطی نہیں کر سکتا۔

وہ لڑکا جب غلطی کرے گا اُس کی ذہانت و محنت کی کمی سمجھی جائے گی۔ وہ جب نسخہ غلط لکھے گا حذاقت کے نقص کا نتیجہ ہو گا، وہ جب بحث میں غلطی کرے گا اس کی مہارت کی کمزوری ثابت ہو گی، وہ جب فیصلہ غلط کرے گا اس کی قانون دانی محل بحث قرار پائے گی، وہ جب محاورہ کی غلطی کرے گا اس کی زبان دانی کا قصور ہو گا۔

اگر یہ دونوں ہی انسانی کمزوریاں ہیں اور اُن کو ایک انسان میں ہونا چاہیے تو گناہ کو بھی یہ کہا جائے کہ وہ رسول سے ہو سکتا ہے مگر دوسروں کی بہ نسبت کم اور غلطی یا لغزش بھی ہو سکتی ہے مگر دوسروں کے لحاظ سے کم۔ اور اگر گناہ ایک انسان سے باوجود انسان ہونے کے بالکل مفقود ہو سکتا ہے اور اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ "وہ اپنی نیت کے لحاظ سے" اپنے مقاصد کے نقطۂ نظر سے یقیناً ایک معصوم انسان ہے" تو غلطی بھی ایک انسان سے باوجود انسان ہونے کے بالکل مفقود ہو سکتی ہے۔ پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ "لیکن اپنے تدابیر، اپنی فہم و دانش کے لحاظ سے اس کارزارِ عالم میں وہ کبھی کبھی اجتہادی غلطی بھی کر سکتا ہے۔"

اگر یہ کہا جائے کہ "اجتہادی غلطی" درحقیقت ایک انسان کے لیے کسی طرح کا نقص اور عیب ہے ہی نہیں تو پھر آخر رسول میں جیسے کہا گیا ہے کہ وہ بلند ترین سطح کا انسان ہے غلطی کو دوسرے تمام افراد کی بہ نسبت بہت کم قرار دینے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی؟

اس کو دوسروں کی بہ نسبت رسول میں کم قرار دینا ہی صاف غمازی کر رہا ہے کہ یہ ایک دھبہ ضرور ہے جو انسانیت کے دامن پر بدنما حیثیت رکھتا ہے پھر ایک ایسی ہستی کے لیے جو بقول آپ کے ایک بلند ترین سطح سے تعلق رکھتی ہے اُسے بالکل مفقود مان لیا جائے تو کیا گناہ ہے؟ اس صورت میں وہ انسانیت سے خارج کیونکر ہو گا جبکہ اس دھبے کے کم ہونے سے اس کی انسانیت کی کمی نہیں ثابت

تعلق ہے۔ ایک رسول کبھی کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔
جس حد تک مذہب کا تعلق تھا آپ کی ہر تعلیم وحی و الہام کے
ماتحت ہوتی تھی اور اس میں کبھی لغزش کا امکان نہ تھا۔"
اب فرمایئے کہ اس "مرتکب نہیں ہو سکتا" اور "امکان نہیں ہے"
کے کیا معنی ہیں؟

لفظی تعبیر کے اسی الجھاؤ میں پھنس کر فرقۂ شیعہ کے اس عقیدہ پر کہ خدا کے لیے ظلم محال ہے۔ فعل قبیح محال ہے، کذب محال ہے، وعدہ خلافی محال ہے، جس کے دوسرے الفاظ یہی ہوسکے کہ خدا ظلم نہیں کر سکتا، فعل قبیح نہیں کر سکتا، جھوٹ اور وعدہ خلافی کا مرتکب نہیں ہو سکتا، جمہور اہل اسلام کی جانب سے بڑی لے دے ہوتی ہے کہ دیکھو یہ خدا کی قدرت کے منکر ہیں اور اس کو عدل پر مجبور قرار دیتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، شیعہ عموم قدرت کے منکر نہیں ہیں، مگر وہ کہتے ہیں کہ باری تعالےٰ کی حکیمانہ شان اس کی قدرت کو ان امور کے ساتھ متعلق ہی نہیں ہونے دے سکتی۔

بالکل اسی صورت سے عصمت کے مسئلہ میں "گناہ نہ کر سکنے" یا "گناہ کی غیر ممکن ہونے" کے یہ معنی قرار دینا کہ معصوم گناہ پر قادر ہی نہیں ہے بالکل غلط ہے۔ "وہ گناہ نہیں کر سکتا" اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی عفت نفس اور

اس کے معنی یہی ہیں کہ جو اس سے زیادہ ذہین طالب علم ہو۔ جو اس سے زیادہ حاذق طبیب ہو۔ جو اس سے زیادہ ماہر وکیل ہو۔ جو اس سے زیادہ قانون داں جج ہو، جو اُس سے زیادہ محاورہ داں اہلِ زبان ہو اس سے یہ غلطی غیر ممکن ہے۔

"غیر ممکن ہے" کیا معنی؟ یعنی اس کی ذہانت، اس کی حذاقت، اس کی مہارت، اس کی قانون دانی، اس کی زباں دانی غلطی سے مانع ہے۔ اس لیے غیر ممکن

یوں ہی اگر کہا جائے کہ نبیؐ و رسولؐ سے گناہ ہونا غیر ممکن، غلطی ہونا غیر ممکن تو اس غیر ممکن کے یہی معنی کیوں نہ قرار دیے جائیں کہ اُس کا کامل احساس فرائض، اس کی پوری معرفت و حقیقت شناسی اور اس کی کامل عقل و معاملہ فہمی گناہ اور غلطی سے مانع ہے۔

لطف یہ ہے کہ جناب مدیر نگار "اس نہ کر سکنے" پر ایک جگہ سخت احتجاج کرنے کے بعد اور یہ کہنے کے بعد کہ "ایک انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ باوجود گناہ پر قدرت رکھنے کے اس سے باز آئے، وہ جھوٹ بول سکتا ہو، لیکن نہ بولے، وہ غصہ کر سکتا ہو لیکن نہ کرے، ماحول سے متاثر ہو سکتا ہو لیکن نہ ہو" اس کے بعد پھر خود ہی حضرت رسولؐ کی عصمت پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ تحریر فرما گئے ہیں کہ:۔

"میں کبھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہؐ کسی معصیت یا گناہ میں مبتلا ہو سکتے تھے کیونکہ گناہ کا تعلق انسان کے ارادہ اور خرابیٔ ضمیر سے ہے اور اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک نیت و ارادہ کا

ان کی دلیل اس کے اوپر یہ ہے کہ "گناہ کا تعلق انسان کے ارادہ اور خرابیٔ ضمیر سے ہے اور اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک نیت و ارادہ کا تعلق ہے ایک رسول کبھی کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا، لیکن گناہ کے علاوہ ایک چیز اور ہے جسے انسانی لغزش، اجتہادی غلطی، نسیان اور بھول چوک کہتے ہیں اور اس کا امکان ہر وقت انسان سے ہے"

میں سمجھتا ہوں کہ ایک نبی کے ساتھ امت کا تعلق اگر وہ ہوتا جو ایک سالک مرتاض پیر مرشد کے ساتھ اس کے پاک باطن مرید کا یعنی نبی صرف روحانی حیثیت سے بندگانِ خدا کو خدا سے تقرب حاصل کرنے کا ایک باطنی ذریعہ ہو، تاکہ اس کی روحانی قدس و پاکیزگی سے فیض حاصل کر کے خلق خدا واصل الی اللہ ہو جائے اور اپنے نفس کو پاکیزہ بنا کر خدا کی بارگاہ سے نزدیکی حاصل کر لے تو بے شک اس کے لیے صرف رسول کا پاک باطن اور ضمیر کی خرابیوں سے علیحدہ ہونا ضروری تھا تاکہ اس کی باطنی صفائی اور نیت کی پاکیزگی سے مرتاض مرید کی روحانیت میں اضافہ ہو اور اس کے نفس میں صفائی پیدا ہو، اس کے لیے اس میں کسی قسم کی معاملہ فہمی اور اصابت رائے عقلی کمال کی ہرگز ضرورت نہیں ہے کیونکہ آخرت کی نجات کا تعلق ضمیر و نیت ہی کے ساتھ ہے اور اس لیے صاف سادہ مسلمانوں کے لیے یہ روایت زد زبان ہے کہ "اہل الجنۃ بلہ" (یعنی بہشت کے لوگ سادہ لوح بھولے بھالے ہوتے ہیں) اور اسی لیے

پارسائی قدسی نزاہت اور حکیمانہ رفعت ارادۂ گناہ سے مانع ہے۔

وہ چاہے تو گناہ کر سکتا ہے مگر اپنے بلند انسانی خصوصیات کی بناء پر وہ چاہے ہی گا نہیں۔

اس سے ہرگز قدرت سلب نہیں ہوتی اور نہ پیدائشی معصومیت سے متصف کرنا لازم آتا ہے، جو بے شبہہ منصب نبوت کی توہین کرنا ہے۔

دوسرا سوال

"انبیاء و آئمہ اگر غلطی یا لغزش سے پاک تھے تو اس کے عقلی یا نقلی دلائل کیا ہو سکتے ہیں؟

یہی پہلے سوال کے آخری جزو کا ماحصل ہے جس کے الفاظ یہ تھے کہ " اگر لغزش و نسیان، اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء و آئمہ کو غیر معصوم بنانے کے لیے کافی ہے تو کیوں؟

جناب نیاز کا فیصلہ اس کے متعلق جو کچھ ہے وہ ان کی سابقہ عبارت سے ظاہر ہو چکا ہے۔ یعنی اُن کا خیال ہے کہ گناہ سے تو ایک نبی یا رسول کا معصوم ہونا ضروری ہے لیکن لغزش و نسیان اور اجتہادی خطا کا امکان ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ رسول کسی معاملہ میں جو رائے قائم کرے وہ درست نہ ہو اور اس میں غلطی ہوئی ہو۔

تو ایسا شخص ہرگز اصلاح خلق اور رہنمائی امت کے قابل نہیں سمجھا جا سکتا اور کسی طرح نبوت و رسالت کے عہدہ کا اہل نہیں ہے۔

دنیا کے ہر شعبہ میں ایسی عصمت کی تلاش ہوتی ہے۔ مریض کو لاکھ یقین دلائیے کہ فلاں حکیم تمہارے بارے میں "بدنیت" ہرگز نہیں ہے یعنی وہ جان بوجھ کر تمہیں نہیں مار ڈالے گا لیکن اس کی اس "نیک نیتی" سے کبھی اس کے مرض کا "درماں" نہیں ہو سکتا جبکہ وہ نسخوں میں غلطی کر جائے یعنی زہر کو تریاق سمجھ کر دے دیتا ہو، وہ تلاش کرے گا "حاذق" کی یعنی جس سے غلطی نہ ہوتی ہو۔

ایک موکل کو ہزار اطمینان دلائیے کہ فلاں وکیل تمہارا دشمن نہیں ہے اور سمجھ بوجھ کر تمہارے مخالف پیروی نہیں کرے گا، مگر کیا نتیجہ جبکہ اسے معلوم ہو کہ اس میں اصابت رائے نہیں یعنی وہ مضر پوائنٹس کو مفید سمجھ کر عرضی دعوے میں یا تحریر کرتا ہے یا بحث میں پیش کرتا ہے جس کی وجہ سے مقدمہ ہار جاتا ہے۔ وہ تلاش کرے گا، "ماہر فن" وکیل کی یعنی جو دھوکا نہ کھاتا ہو۔

ایک طالب علم کو کتنا ہی مشورہ دیجیے کہ فلاں استاد سے تعلیم حاصل کرو، وہ تمہیں غلط مطلب غلط سمجھتے ہوئے نہیں بتائیں گے، وہ کہے گا پھر میرا کیا فائدہ جبکہ وہ غلط مطلب صحیح سمجھ کر مجھے بتلائیں اور میری ذہنی گمراہی کا سبب قرار پائیں، وہ تلاش کرے گا ایسے معلم کی جو صحیح مطلب سمجھا ہو اور اسے صحیح طریقہ سے سمجھا بھی دے۔

وکالت، بیرسٹری، پروفیسری، ماسٹری، تھانہ داری، ججی، کلکٹری

ایک بہت بڑے عالم اسلام کا مقولہ ہے:۔

"رب رجل نرجو شفاعتہ ولا نقبل شہادتہ"

"(یعنی) بہت سے ایسے آدمی ہیں کہ ہم اپنے لیے ان کی شفاعت کے متو
ہو سکتے ہیں (کیونکہ یہ آخرت کا معاملہ ہے) لیکن محکمہ قضا میں ان کی گواہی قبو
کریں گے (کیونکہ اس میں معاملہ فہمی اور عقل و تدبر کی ضرورت ہے۔)"

مگر ایک نبی و رسول کی نسبت یہ خیال اگر کوئی ملائے مسجد یا صاف
مقدس "مولوی" ظاہر کرتا تو پھر بھی قابل تعجب نہ تھا، لیکن جناب مدیر نگار ا
روشن خیال، وسیع النظر، متنور الفکر انسان کی جانب سے ہرگز اس کا اظہار ممک
نہیں ہے۔

پھر جبکہ رسول کی حیثیت صرف ایک واسطۂ روحانی اور وسیلۂ با
کی نہیں ہے بلکہ وہ امت کی عملی اصلاح کا ذمہ دار، ان کے انسانی خصو
کا مکمل اور اپنے قول و عمل سے ان کا حقیقی رہنما اور ان کے لیے اتبا
پیروی کے واسطے ایک نمونہ ہوتا ہے تو اب اس کے لیے صرف باطن کا
اور ضمیر کا پاک ہونا ہرگز کافی نہیں ہے۔ وہ اپنے باطن اور ضمیر کے لحا
سے کتنا ہی مکمل ہو لیکن اگر وہ قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا رہے، رائے قا
کرنے میں غلطیاں کرتا ہو، غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط سمجھ لیتا ہے اور غلط
عمل کو صحیح سمجھ کر اختیار کرتا ہے، اور غلط راستہ پر چلتا اور دوسروں کو چلاتا ہ

پر مبنی ہے۔ اس نے اگر "معصوم" کو نہ ڈھونڈھا تو وہ اپنے "حکیمانہ انتخاب" میں مجھ سے بھی پست ہو گیا۔ اس لیے منتخب کرے گا تو وہ معصوم ہو گا اور چونکہ اس کا ڈھونڈھ کر منتخب کرنے والا میں نہیں ہوں بلکہ خدا ہے اس لیے وہاں "کم از کم" والی حد بندی کے کوئی معنی نہیں۔ وہ مقرر کرے گا تو ایسے ہی کو جو بالکل غلطیوں سے مبرا معصوم عن الخطاء ہو۔

اور یہی رمز ہے کہ شیعوں نے امامت میں بھی عصمت کی شرط لگا دی ہے چونکہ امامت و خلافت بھی ان کے نزدیک مثل نبوت کے خدا کی طرف کا مقرر کردہ منصب ہے اس لیے "رمز عصمت" میں نبوت و امامت دونوں مشترک حیثیت رکھتے ہیں جیسی عصمت کی ضرورت "نبوت" میں ویسی ہی "امامت" میں تفرقہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

بھلا بتائیے تو سہی کہ صرف نیک نیتی اور ضمیر کی پاکیزگی ایک نبی و رسول کے لیے کس مرض کی دوا ہو گی۔ اور مقصد نبوت و رسالت کو کس طرح پورا کرے گی جبکہ ان کی غلطیوں کی بنا پر اس کے ہاتھوں خلق خدا کے گمراہ ہونے کا اندیشہ موجود ہے۔

چلتی ہوا کے جھونکے کو جبرئیل کے پر کی ہوا سمجھا اور نیک نیتی کے ساتھ حقیقتہً یقین کر لیتا ہے۔ دیوار کے پیچھے چھپے ہوئے انسان کی

محدود نہیں ہے اور اطلاع کوتاہ نہیں ہے اور جس سے خود بھی غلطی کا امکان نہیں ہے تو ہم کو
سمجھنا لازمی ہے کہ اس نے بھی "عصمت" کے جوہر کو نظر انداز نہیں کیا ہوگا اور چونکہ اس کے
علم و قدرت میں کوتاہی نہیں اس لیے اس کو "کم از کم" والی مجبوری پیش نہ آئی ہوگی
اور اس نے کامل "غلطی سے مبرا" ہی کو مقرر کیا ہوگا جس کی اصطلاحی لفظ
"معصوم" ہے۔ میں طبیب ڈھونڈھتا ہوں "معصوم" مگر مجھے ملتا نہیں۔ اگر خدا میرے
لیے کسی طبیب کو خود مقرر کر دے تو مجھے یقین کرنا چاہیے کہ وہ اس کے علم میں
"معصوم طبیب" ہے اور اس کے علم میں تخلف نہیں ہے۔

میں وکیل ڈھونڈھتا ہوں "معصوم" مگر میرے امکانی ہاتھوں سے دستیاب
نہیں ہوتا، اگر خدا میرے مقدمہ کی پیروی کے لیے کوئی وکیل مقرر کر دے تو میں
یقینی طور پر سمجھوں گا کہ وہ "معصوم وکیل" ہے۔ ایسے ہی ہر شعبہ میں۔

نبی و رسول کا تقرر اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں بھی اپنے نزدیک نبوت و
رسالت کے لیے "معصوم" ہی کو ڈھونڈھتا مگر جیسے طبیب مجھے بالکل معصوم نہ ملا،
وکیل بالکل معصوم نہ ملا۔ ویسے نبی و رسول بھی بالکل معصوم میرے ہاتھوں سے دستیاب
نہ ہوتا مگر جو سب سے زیادہ مکمل درجہ میری تلاش میں ملتا اُس کو اپنا مقصد قرار
دے لیتا، میں بے شک ایسے کو نبی بنا لیتا اور رسول منتخب کر لیتا جو میرے حدود
اطلاع میں غلطیوں سے زیادہ سے زیادہ محفوظ ہو یعنی کم سے کم غلطیوں کا ارتکاب کرتا
ہو لیکن نبوت کا عہدہ تو براہِ راست خدا سے تعلق رکھتا ہے اور اسی کی قرارداد

سے شروع ہوتے ہیں۔ نیز عقلی احکام قطعی حیثیت رکھتے ہیں لیکن نقلی دلائل زیادہ تر مظنون الدّلالتہ۔ اس لیے ظاہری الفاظ کسی مسلّمہ عقلی کے خلاف بھی نظر آتے ہیں تو انھیں بہرحال ایسے معنی پہ محمول کیا جاتا ہے جو قطعی الثبوت نتائج کے خلاف نہ ہوں۔

اسی لیے "الرحمٰن علی العرش استویٰ" کے الفاظ سے خدا کے تمکن جسمانی اور "یداہ مبسوطتان" سے خدا کے لا بنے لابنے ہاتھوں کا عقیدہ درخور قبول نہیں قرار دیا گیا اور اس کے معنی بہرحال ایسے قرار دیے گئے جو ذوق سلیم کے بالکل خلاف بھی نہ ہوں اور ایک قطعی الثبوت حقیقت کے منافی بھی نہ قرار پائیں۔ یہی صورت نبوت کے عقیدہ کی ہوا اسی بنا پر خود جناب نیاز کو بھی تاویل سے چارہ کار نظر نہیں آیا کیونکہ "گناہ" سے انبیا کی عصمت کا خود انھوں نے اقرار کیا ہے مگر ان کے پیش کردہ آیات میں گناہ ہی کے مرادف لفظ کا ذکر ہے۔ استغفر لذنبک اور لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک ان دونوں آیتوں میں صاف "ذنب" کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں گناہ اور مغفرت کی لفظ کا تعلق بھی یہی بتلاتا ہے اور "عفا اللہ عنک" کے الفاظ بھی اسی کی ترجمانی کرتے ہیں مگر چونکہ گناہ کی نسبت کو خود ان کی عقل نے بھی قطعی طور پر منتفی قرار دیا ہے اس لیے انھوں نے ان تمام آیات کو خود اپنے اجتہادی غلطی پر ڈھالا ہے حالانکہ اجتہادی غلطی ہرگز "ذنب" کا مصداق نہیں ہوتی۔

کی آواز کو صدائے غیبی جانتا اور اس پر ایمان لے آتا ہے اور اپنے دل میں پیدا شدہ خیالات کو خواہ مخواہ خدا کی طرف سے نازل شدہ خیال کرتا اور واقعی اعتقاد کر لیتا ہو۔ غلط باتوں کو صحیح سمجھتا اور اپنے نزدیک لوگوں کو اسی صحیح راستہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ غیر ضروری باتوں کو ضروری اور نا روا افعال کو لازم العمل سمجھ کر دنیا کو دعوت دیتا ہے سختی کے ساتھ ان پر خود کاربند ہوتا اور دوسروں کو کاربند بناتا ہو۔ یقیناً ایسے شخص کے دامن پر "گناہ" کا دھبہ مشکل سے لگایا جا سکے گا، اس کے ضمیر پر حملہ ہرگز روا نہ ہوگا سزائے اخروی کا ایسے شخص کو مستحق ثابت کرنا بہت دشوار ہے لیکن کیا مقصد نبوت و رسالت ایسے شخص سے انجام پایا؟ ہدایت خلق کا مقصد حاصل ہوا اور دنیا ہدایت یافتہ ہوئی؟

میں سمجھتا ہوں کہ کسی چھوٹے موٹے گناہ کو گناہ سمجھ کر کرنا اور دنیا کو بتلا دینا کہ یہ گناہ ہے اتنا خطرناک اور مقصد نبوت کے لیے مضرت رساں نہیں ہے جتنا غلط فہمیوں میں مبتلا ہونا، گناہ کو ثواب سمجھ کر کرنا اور غلط مسلک کی طرف صحیح سمجھ کر رہنمائی کرنا۔

مسائل الوہیت و نبوت کے بارے میں جہاں تک ارباب تحقیق کا خیال ہے ان کا اصل تعلق عقلی احکام کے ساتھ ہے اور دلائل نقلیہ کو ثانوی حیثیت حاصل ہے کیونکہ نقل کے حدود عمل ہی ان دونوں مرحلوں کے بعد

جنہوں نے خطاء اجتہادی کو رسول کے لیے جائز کہا ہے انھوں نے بھی یہ کہا ہے کہ رسول سے خطاء اجتہادی ممکن تو ہے مگر خدا اس خطا پر رسول کو برقرار نہیں رہنے دیتا اس کی طرف سے اس خطا کی اصلاح ہوتی ہے اور اس کے نظائر میں یہی مثالیں پیش کی جاتی ہیں کہ :-

"عبس وتولیٰ ان جاءہ الاعمیٰ" ــــــ اور "عفا اللہ عنک لم اذنت لھم" ــــــ وغیرہ۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ جہاں پر خطا کی اصلاح نہ ہو اور کسی آیت کے ذریعہ سے اس خطا پر متنبہ نہ کیا گیا ہو وہ خطا نہ سمجھی جائے گی بلکہ رسول کا قول وعمل خداوند عالم کی جانب سے متنبہ نہ کئے جانے کے ضمیمہ کے ساتھ دلیل قطعی ہوگا اس طرز عمل اور ہدایت کی صحت کا۔

اب یہ ملاحظہ کیجیے کہ خلافت جناب امیرؑ کے مسئلہ میں اگر رسول سے خطاء اجتہادی ہوئی تو اس کا سلسلہ کب سے شروع ہوا؟ اس وقت سے کہ جب نبوت کا ابتدائی دور تھا اور دعوت العشیرہ میں پیغمبرؐ نے لوگوں سے اپنی نصرت کا وعدہ لینا چاہا اور کوئی طیار نہ ہوا اور صرف حضرت علیؑ تھے جنہوں نے لبیک کہی اور اس وقت رسول نے ارشاد کیا کہ یہی میرا وزیر ہوگا خلیفہ ہوگا اور جانشین ہوگا۔

اس وقت سے خطاء اجتہادی کی بنیاد پڑی اور پھر ہر موقع پر رسول اپنی اس خطاء اجتہادی کا پروپیگنڈا کرتے رہے جس میں ماہ گذرے سال گذرے۔ رزم و بزم کتنے ہی مواقع سامنے آگئے اور ہر جگہ پیغمبرؐ نے اپنے اس پروپیگنڈے کو نہیں چھوڑا یہاں تک کہ سب سے آخر میں ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں حج آخر کے بعد بڑے شد ومد

اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول کو نمونۂ عمل قرار دیا گیا ہے جس کے بعد غلطی کے امکان کے کوئی معنی نہیں۔

"انک لعلی خلق عظیم" میں بھی خدائے عظیم کی جانب سے رسول کے افعال و اعمال کو اعتدال عظیم پر فائز قرار دے کر اس میں کسی طرح کے نقص و کمزوری کے شبہہ کا سد باب کر دیا ہے۔ اور "النبی اولی بالمومنین من انفسھم" کے الفاظ میں اُن کو تمام مومنین کے متعلق خود ان مومنین کے ذاتی اختیارات سے بالاتر اختیارات تفویض کر کے اس کی ذمہ داری لے لی ہے کہ یہ جو کچھ مسلمانوں کے حق میں کریں گے۔ وہ مسلمانوں کے لیے مفید ہی ہوگا جس کے بعد اس کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ جو کچھ انھوں نے مسلمانوں کے لیے سوچا ہو اور طریق عمل اختیار کیا ہو اور انھیں ہدایت کی ہو وہ درحقیقت موزوں نہ ہو اور خود مسلمان ان کے حکم کے خلاف اپنے لیے جو صورت تجویز کریں وہ مناسب و اصلح ہو۔

درحقیقت ایک نبی و رسول کے لیے غلطی کا امکان ہونے کی صورت میں پھر تو اس کے کسی قول و فعل پر قطعی طور سے اعتماد ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ ٹھیک ہی ہے زیادہ سے زیادہ ظن حاصل ہوگا، لیکن اصول عقائد میں ظن کوئی چیز نہیں۔

"ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً"، اسی لیے بعض دوسرے علمائے اسلام

ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون"

اہل سنت کی تفسیریں اٹھا کر دیکھو، سب نے یہ روایت لکھی ہے کہ مراد اس سے علیؑ ہیں۔ اب لاکھ اہل سنت شور مچائیں کہ "ولی" کے معنی یہاں مددگار، ناصر، دوست وغیرہ کے ہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ولی کے معنی حاکم و متصرف کے بھی ہیں ضرور۔ اب فرض کرو کہ خدا کا مقصود اس لفظ سے وہی ناصر و مددگار رہا بھی ہو لیکن کیا اس سے رسولؐ کی اس خطائے اجتہادی کو تقویت حاصل نہیں ہوئی؟

رسول نے کہا: "انا مدینۃ العلم وعلی بابھا فمن اراد العلم فلیات الباب" میں شہر علم ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں، تو جو شخص علم کا طالب ہو وہ دروازہ پر آئے۔

خدا نے ارشاد کیا: "لیس البر بان تأتوا البیوت من ظھورھا ولکن البر من اتقی واتوا البیوت من ابوابھا" یعنی ہرگز یہ حسن عمل نہیں ہے کہ تم گھروں میں پشت کی طرف سے داخل ہو بلکہ گھروں میں جاؤ تو دروازوں کی طرف سے جاؤ۔"

اب سنی کہیں اور ممکن ہے سچ بھی کہتے ہوں کہ یہ عام بات ہے اس کا علی سے کوئی تعلق نہیں مگر رسول کے اس قول کے ساتھ اس آیت کے اترنے نے رسول کے پروپیگنڈے کو کیا قوت نہیں پہنچائی؟

کے ساتھ رسولؐ نے تقریر کر کے مسلمانوں کے سامنے اپنے اس نظریہ کو پیش کیا
خلق خدا کو عام دعوت دی اور علیؑ کی خلافت کا اعلان کیا۔

اس کے بعد جب مدینہ واپس آ گئے تب بھی جب تک مرض الموت کی شدت
انتہا تک نہیں پہنچی، جب تک کہ بات کرنے اور تقریر کرنے کا دم رہا اپنی اس خطا
اجتہادی کی تبلیغ کرتے رہے۔ اور اس طول طویل مدت، تمام زمانہ رسالت میں چھ
چھوٹی باتوں پر خدا نے تنبیہ کی۔ اندھے کی بات نہ سنی اور اس کی طرف سے منہ پھیر لیا
تنبیہ ہوئی۔ بعض لوگوں کو جنگ میں شمولیت کی اجازت دی تنبیہ ہوئی۔ بعض عورتوں
اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تنبیہ ہوئی۔ سورہ برأت سنانے کسی غیر مستحق کو بھیج دیا تنبیہ
ہوئی۔ لیکن اتنے مہتم بالشان مسئلہ میں رسول آخر عمر تک خطاء اجتہادی پر برقرار
اس کی تبلیغ کرتے رہے۔ اس کی جانب دعوت دیتے رہے۔ مگر خدا نے آدھی بات
بھی نہ کہی ذرا کمزور سے کمزور اور چھوٹی سے چھوٹی تنبیہ بھی نہ ہوئی، یہاں تک
کہ سورہ مائدہ کے نزول کے بعد جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ہوا پھر قرآنی نز
کا سلسلہ بھی بند ہو گیا مگر رسول اس کے بعد بھی اپنی خطاء اجتہادی پر قائم رہے۔

بلکہ اس دوران میں خدا نے عوض اس کے کہ رسول کو ان کی خطاء اجتہادی کا
تنبیہ کرتا اپنے رویہ سے ان کی خطاء اجتہادی کو اور تقویت دی، مثلاً!

علیؑ نے سائل کو حالت رکوع میں انگوٹھی دے دی، وہاں سے آیت اتر
" انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ

ہیں یا وہ بالکل بے گناہ۔ اور پھر جب تیسرا صحابی خطائے اجتہادی میں مبتلا ہو سکتا ہے اور اپنی عمر بھر مبتلا رہ سکتا ہے تو ہم تو گنہگار انسان ہیں ——— ہم اگر خطائے اجتہادی میں مبتلا ہوں اور عمر بھر مبتلا رہیں تو ہمیں سزا دینے کا کیا حق حاصل ہے؟ اس کا کوئی جواب ہرگز نہ ہوگا۔ اور یقیناً اگر خدا ظالم نہیں ہے تو کبھی وہ ہم کو اس کے لیے آتش جہنم میں نہیں پھینک سکتا۔ ہم نجات کے حق دار ہیں اور کوئی طاقت ہم کو ہمارے اس حق سے محروم نہیں کر سکتی۔

تیسرا سوال

”صحابیت جناب امیرؑ ثابت کرنے کے لیے حضرات شیعہ کیا نصوص قطعیہ پیش کرتے ہیں؟“

”اس بحث کے بہت سے اجزاء ناقص اور غیر مکمل صورت میں ”نیاز“ صاحب کے مضمون میں آ چکے ہیں اس لیے کہ ایک غیر متعلق ہندو دوسرے مذہب کے متعلق کتنی ہی وسعت نظر حاصل کرے لیکن اسی مذہب کے ایک واقف کار انسان کے برابر کبھی نہیں ہو سکتا، اور ان اجزاء کے ثبوت و صحت پر جناب نیاز کی مہر تصدیق بھی ثبت ہو چکی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ ہم ان کو اس جگہ مکمل اور حقیقی صورت کے ساتھ پیش کر دیں جس کی بنا پر ان کو شیعہ بطور

رسول سورۂ برات لے جانے پر حضرت ابوبکر کو مامور کرتے ہیں۔ خدا
واپس منگواتا ہے یہ کہہ کر کہ تمہاری نمائندگی صرف علیؑ ہی کر سکتے ہیں۔ اس سے
مقصود خلافت کی قرارداد نہ ہو لیکن کیا رسول کی خطاء اجتہادی کہ جو حضرت علیؑ
کے بارے میں تھی اس سے تقویت نہیں حاصل ہوئی؟

رسول غدیر خم میں تقریر کرتے ہیں اور اپنی "خطاء اجتہادی" کے وسیلہ
"پروپیگنڈے" کا سب سے آخری اور بڑا زوردار کارروائی عمل میں لاکر علیؑ کی خلافت
کا اعلان کرتے ہیں اور خدا کی طرف سے آیت اترتی ہے۔

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام
دینا" (یعنی) آج میں نے تمہارا دین مکمل کیا، آج اپنی نعمت پوری کی اور
تمہارے لیے دین اسلام کو پسندیدہ کیا"

اس سے حقیقت میں مقصود جو کچھ بھی رہا ہو لیکن کیا اس سے رسولؐ
کی خطاء اجتہادی پر مہر تصدیق ثبت نہیں ہوئی؟

میں سچ کہتا ہوں اور خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر شیعہ واقعاً گمراہی
میں مبتلا ہیں اور روز قیامت سوال ہوا تو شیعہ صاف کہہ دیں گے کہ ہماری گمراہی
کی ذمہ دار تیرے حبیب کی خطاء اجتہادی ہے اور اُن کی خطاء اجتہادی کو تقویت
پہنچانے کی ذمہ داری تیرے رویہ اور جانبداری وحمایت پر ہے جس کے بعد اگر
گمراہ ہوئے تو تیرے ہاتھوں اور تیرے حبیب کے ہاتھوں، ہم بالکل بے قصور

اُس وقت تک اس سے تخلف کی کوئی گنجائش نہیں اور اسی بناء پر بعض روایات میں موجود ہے کہ جب اس کے بعد مجمع متفرق ہوا تو قریش جناب ابوطالب (حضرت علیؑ کے والد) سے بطور تمسخر کہتے ہوئے نکلے کہ لیجیے اب تو اپنے بیٹے کی اطاعت کیجیے۔ ان کو آپ پر حاکم مقرر کر دیا گیا۔

پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ پوری کارروائی رسولؐ کی جانب سے بنا بر وحی عمل میں آئی تھی جس کے متعلق قرآن مجید میں آیت موجود ہے۔

"انذر عشیرتک الاقربین واخفض جناحک لمن اتبعک من المومنین" (یعنی) اپنے قریب کے عزیزوں کو متنبہ کرو اور اپنے بازوؤں کو جھکا دو اس شخص کے لیے جو مومنین میں سے تمہارا اتباع کرے۔"

اس میں صاف دو حکم نظر آ رہے ہیں ایک عشیرۂ اقربین کا انذار۔ دوسرے اُس شخص کے لیے جو اتباع کی حامی بھرے اور نصرت کا اقرار کرے ایک خاص قسم کا امتیاز جسے "واخفض جناحک" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تمام مذہبی شعبوں میں "وحی متلو" یعنی قرآن کی ہدایتیں مجمل حیثیت رکھتی ہیں جن کی تفصیل رسولؐ کے عمل سے ہوئی ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے "اقیموا الصلوٰۃ" رسولؐ نے نماز پڑھ کے دکھلائی کہ نماز یوں پڑھی جاتی ہے۔ "کتب علیکم الصیام" رسولؐ نے روزہ رکھ کر دکھلایا کہ اس طرح۔ "للہ علی الناس حج البیت" رسالتمآب نے مناسک حج ادا کر کے ان کی تشریح کی۔ بہرحال جہاں تک دیکھا جائے

نصوص قطعیہ سمجھتے اور پیش کرتے ہیں۔

——— :: نمبر (۱) نمبر :: ———

واقعۂ بعثت عشیرہ جس میں حضرت رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ متعلق یہ ارشاد فرمایا کہ :-

"ھذا اخی و وصیی و خلیفتی فیکم" اس ارشاد کے لب لہجہ اور واقعہ کی بناء پر یہ کہنا کسی صورت سے صحیح نہیں کہ یہ رسولؐ نے بطور مشورہ کیا تھا اور مطلب یہ تھا کہ اگر خلیفہ کا انتخاب کیا جائے تو میری رائے بھی علیؑ کے بلکہ الفاظ اور عنوان واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک قرارداد اور اعلان ہے جو رسولؐ کی جانب سے کیا جا رہا ہے۔

رسولؐ کا سب سے پہلے تمام لوگوں سے مخاطب ہو کر یہ کہنا کہ کون شخص تم میں سے میرا ساتھ دیتا ہے تاکہ وہی میرا خلیفہ و وزیر ہو اور پھر جب سب نے سکوت کیا اور علیؑ نے اقرار نصرت کیا تو رسولؐ کا یہ ارشاد فرمانا کہ "دیکھو یہ ہمارا وصی و خلیفہ و وزیر ہے" غیر مبہم طریقہ سے بتلاتا ہے کہ (الف) رسولؐ خلافت کی قرارداد کا اختیار اپنے لیے سمجھتے تھے ورنہ آپ کو اس معاہدہ کا کوئی حق ہی نہ پیدا ہوتا کہ جو شخص میری نصرت کا اقرار کرے گا وہی میرا خلیفہ و وزیر قرار پائے گا (ب) یہ کہ جب علیؑ نے وعدہ نصرت کر لیا تو اسی وقت معاہدہ کی تکمیل اور ولی عہدی و جانشینی کا اعلان کر دیا گیا، اس وقت تک کہ یہ حکم منسوخ

و نصرت کا اقرار کرنے والی ذات کے لیے ایک امتیاز خصوصی عطا کیا۔

معلوم ہوتا ہے رسول "خفض جناح" (یعنی بازو جھکا دینے) کا مطلب سمجھے ایک طرح کے معاہدہ و اقرار کا بار اپنے کاندھوں پر لے لینا۔

ممکن ہے کوئی شخص یہ خیال کرے کہ پیغمبر نے خدا کے الفاظ سمجھنے میں غلطی کی "خفض جناح" کے یہ معنی ہرگز نہیں ہو سکتے مگر اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ رسول نے جو کچھ کیا وہ "نیک نیتی" کے ساتھ اپنے خیال میں "بر بنائے وحی" اب اگر ان سے الفاظ وحی کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی تو خدا کا فرض تھا کہ وہ ان کو اس غلطی پر متنبہ کرے اور اس کی اصلاح کر دے اور پھر وحی کے مفاد اور تبلیغ احکام خداوندی میں غلطی تو ایسی چیز ہے جسے غالباً جناب نیاز صاحب بھی رسول کی ذات کے لیے غیر ممکن قرار دیتے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علی کی جانشینی کا یہ اعلان بر بنائے وحی تھا اور حکم خداوندی کی بناء پر تھا جو وحی متلو یعنی قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔

——— (۲) ———

آیت ولایت۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"انما ولیکم اللہ و رسولہ و الذین آمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون۔"

اس کے لیے ملاحظہ ہوں ذیل کی روایات۔

مذہب کے ہر شعبہ میں قرآنی مندرجات ایک اجمال کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی تشریح ہمیشہ افعال پیغمبر سے ہوتی ہے۔

"واخفض جناحک لمن اتبعک" کا جزو جو "انذر عشیرتک الاقربین" کے ساتھ لگا ہوا ہے اور جس سے باجماع مفسرین بیعت عشیرہ کا واقعہ مراد ہے صاف تبلا رہا ہے کہ یہ "واخفض جناحک" کا حکم کوئی عام بات نہیں ہے جو اس موقع سے کوئی خصوصی تعلق نہ رکھتی ہو بلکہ اس کا تعلق اس موقع کے ساتھ ضرور ہے "واخفض جناحک" کے معنی حسن اخلاق سے پیش آنے کے لینا رسول کے وسعت اخلاق کی توہین کرنا ہے کیونکہ وہ رسول تو ایسا تھا کہ جو کفار و مشرکین تک سے حسن اخلاق کے ساتھ پیش آتا تھا۔

یقیناً یہ "واخفض جناحک" جو "من اتبعک من المؤمنین" کے ساتھ مخصوص قرار دیا گیا ہے کسی طرح کے امتیاز خصوصی کا پتہ دیتا ہے جو اس موقع پر اتباع کا اقرار کرنے والے کی ذات سے متعلق ہے۔ رسول کے عمل سے ظاہر ہے کہ انہوں نے دونوں جزوں کا امتثال کیا اور اسی امتثال سے درحقیقت ان کے معانی کی تشریح ہوتی۔

انہوں نے اپنے اعزا و اقارب کو جمع کر کے تبلیغ و دعوت کے ساتھ "انذر عشیرتک الاقربین" کی ہدایت کو انجام دیا اور "لمن اتبعک من المومنین" کے لیے خصوصی حیثیت سے "واخفض جناحک" کے اتباع میں انہوں نے اتباع

بے شک کیا ضرورت ہے اگر قرائن کی بنا پر ان ہی معنی کا تعین نہ ہوتا
ہو کیونکہ لفظ مشترک کا کسی ایک معنی کے ساتھ تعلق ہمیشہ قرائن ہی کی بنا پر ہوتا ہے۔
یہاں مددگار و ناصر مراد لینے سے ایک تو خاص کوئی محصل اس آیت کا ہوتا
ہی نہیں اس لیے کہ مددگار و ناصر تو ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا ہے۔ ارشاد ہوا ہے
"والمومنون بعضہم اولیاء بعض" (یعنی مومنین آپس میں ایک
دوسرے کے مددگار ہیں) پھر اس میں تخصیص کے کیا معنی؟ اور پھر رسول اپنے
قول و عمل سے اسی لفظ کی حاکم و متصرف کے معنی میں تکرار کر کے برابر تفسیر
کرتے رہے، جیسے بریدہ کی روایت جس میں آپ نے فرمایا "وھو ولیکم بعدی"
ان الفاظ کا تذکرہ کثیر التعداد روایات میں موجود ہے۔ جن میں سے بعض
"ہمنام" صاحب کے مضمون میں آ چکی ہیں۔ پھر جبکہ رسول کے ان ارشادات
میں واضح طور پر یہ معین ہے کہ ولی کے معنی حاکم و متصرف کے ہیں اور اسی
بنا پر جناب مدیر نگار نے بھی تحریر فرماتے ہیں۔
"اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان کے
بعد جناب امیر خلیفہ قرار دے جائیں جیسا کہ آپ نے بارہا اشارۃً و
کنایۃً کیا بلکہ ایک حد تک صراحتاً اس کو ظاہر بھی کیا"
اور جبکہ یہی "ولی" کی لفظ قرآن مجید میں بھی موجود ہے اور جبکہ بروایت مفسرین
وہاں بھی ولایت کی صفت علی کے لیے قرار دی گئی ہے تو پھر آخر رسول کے

الخطیب فی المتفق عن ابن عباس - عبدالرزاق - عبد بن حمید - ابن جریر - ابوالشیخ - ابن مردویہ عن ابن عباس - طبرانی فی الاوسط - ابن مردویہ عن عمار بن یاسر - ابوالشیخ - ابن مردویہ عن علی بن ابی طالب - ابن ابی حاتم - ابوالشیخ - ابن عساکر عن سلمہ بن کہیل - ابن جریر عن مجاہد - ابن جریر عن السدی و عتبہ بن حکیم - طبرانی و ابن مردویہ ابونعیم عن ابی رافع - ابن مردویہ عن ابن عباس -

(درمنثور للحافظ السیوطی - جلد ۲ - صفحہ ۲۹۳ - ۲۹۴)

ان روایات میں متفقہ طور پر یہ مذکور ہے کہ یہ آیت اس موقع پر اتری ہے کہ جب حضرت علیؑ نے ایک سائل کو نماز میں انگشت شہادت کے اشارہ سے انگوٹھی دی تھی۔

فضا کے سیاسی تقاضا کی بنا پر علیؑ کی کوئی فضیلت بلا معارض تو رہ ہی نہیں سکتی تھی اس لیے اس آیت کی نسبت بھی بعض روایات دوسری موجود ہیں مگر نہ کوئی بالا محدثین کی شہادتیں جو بہرحال علیؑ کے ساتھ کوئی جانبداری نہ رکھتے تھے اور نہ مذہبی حیثیت سے ان کو اس روایت کے گھڑنے کی ضرورت تھی ان دوسرے معارض روایات کو جو بجائے خود بھی متعارض ہیں بالکل مشکوک بنا دیتی ہیں اور اسی لیے تمام مفسرین اہل سنت اس روایت کے بالکل انکار کی گنجائش ہرگز نہیں پاتے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ "ولی" کے معنی ناصر و مددگار کے ہیں۔ حاکم و متصرف کے معنی مراد لینے کی کیا ضرورت ہے؟

علی کی امامت کے متعلق قرآنی ہدایت کو بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

حسب ذیل روایات اہل سنت اس باب میں متفق ہیں کہ یہ آیت حجۃ الوداع میں ولایت علی کی تبلیغ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

ابن ابی حاتم۔ ابن مردویہ۔ ابن عساکر عن ابن سعید الخدری ابن مردویہ عن ابن مسعود ابن ابی حاتم عن عنترہ عن علی ابوبکر الشیرازی فیما نزل من القرآن فی علی عن ابن عباس۔ ابواسحٰق احمد بن محمد الثعلبی عن البراء بن عازب۔ محمد بن طلحۃ القرشی فی مطالب السئول باسناد الواحدی عبد الرزاق الرسعنی عن ابن عباس۔ نظام الدین النیشاپوری فی غرائب القرآن عن ابی سعید الخدری و ابن عباس و البراء بن عازب و محمد بن علی السید علی الہمدانی فی مودۃ القربیٰ عن ابن عباس۔ نور الدین ابن الصباغ المالکی فی الفصول المہمۃ باسناد الواحدی۔ بدر الدین العینی فی عمدۃ القاری جمال الدین المحدث الشیرازی فی کتاب الاربعین شہاب الدین احمد فی توضیح الدلائل۔ محمد بن معتمد خان البدخشی فی مفتاح النجا ــــ وغیرہ۔

جو اشخاص اس بارے میں شک و شبہ کرتے ہیں وہ کسی خاص ایسے حکم کا پتہ نہیں دیتے جس کی تبلیغ کا اس زور و شور کے ساتھ تاکیدی حکم ہوا ہو۔ ان میں سے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ "ما انزل الیک ــــ" سے قرآن و شریعت مراد ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ابتدا کے زمانہ

ان ارشادات کے بربنائے وحی ماننے میں کیوں توقف کیا جائے؟ اتنا تو کم از کم ضرور ہی ثابت ہوتا ہے کہ رسولؐ نے اس "ولی" کی لفظ کے معنی جو قرآن میں ہے "حاکم و متصرف" ہی کے سمجھے اور اس سے مراد علیؑ ہی کی ذات قرار دی اور اس لیے وہاں چونکہ خدا و رسولؐ کے بعد ولایت میں علیؑ کا درجہ رکھا گیا تھا لہذا آپ نے بھی ارشاد کیا :- ھو ولیکم بعدی۔"

اب اگر رسولؐ سے الفاظ کے سمجھنے میں غلطی ہوئی تو خدا کا فرض تھا کہ متنبہ کر دیتا اور اس غلطی پر رسولؐ کو برقرار نہ رہنے دیتا اور پھر الفاظ وحی کے غلط معنی سمجھنے کے امکان کا رسولؐ کی نسبت غالباً کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

:(۳):

آیت تبلیغ جس کے الفاظ یہ ہیں :-

"یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس۔"

"(یعنی) اے پیغمبر پہنچا دو اس شئے کو جو نازل کی گئی ہے تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے خدا کی رسالت کو کچھ پہنچایا ہی نہیں اور خدا لوگوں سے تمہاری حفاظت کرے گا۔"

یہی وہ پر زور حکم محکم ہے جس سے حضرت علیؑ کی ولایت کا منجانب اللہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور اسی کو غالباً "ہر نام" صاحب نے لکھا ہے کہ "شیعہ

صحیح نمونہ یا اس سے بڑھ چڑھ کر نہیں ہے۔

الفاظ کی یہ ترکیب صاف بتلاتی ہے کہ "ما انزل الیک" سے کوئی خاص اہم حکم مراد ہے اور اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ یہ حکم ایسا اہم حکم ہے کہ اس کی اگر تم نے تبلیغ نہیں کی تو گویا تمام دین و شریعت کی تبلیغ نہیں ہوئی۔ اس کی مثالیں روزمرہ کی زبان میں بہ ابدا آتی رہتی ہیں۔ محل تاکید میں برابر کہتے ہیں کہ "تم نے اگر یہ کام نہ کیا تو کچھ کیا ہی نہیں"۔ اب وہ خاص حکم کیا ہو؟

آیت سے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ حکم ایسا ہے جس میں خطرات پائے جاتے ہیں اور ان ہی خطرات کا اندیشہ رسول کو اب تک اس حکم کی تبلیغ سے مانع رہا ہے اور درحقیقت رسول حکیمانہ مصالح کی بنا پر اس کے منتظر تھے کہ اس طرح کا تاکیدی حکم خدا کی جانب سے آجائے تو آپ اس اہم اعلان کی طرف اقدام فرمائیں۔ پھر وہ خطرات کیا ہیں؟

یہ بھی آیت سے ظاہر ہے کہ خطرہ کسی آفت ارضی و سماوی، کسی بلائے ناگہانی، کسی آندھی پانی کا نہیں ہے۔ بلکہ لوگوں سے خطرہ ہے۔ لوگوں کی مخالفت سے صرف نہیں، بلکہ ضرر رسانی اور اتلاف جانی سے اور اگر ایسا نہ ہو تو "واللہ یعصمک من الناس" کے ٹکڑے کا کوئی محل نہیں۔

آیت سورہ مائدہ کی ہے جو حجۃ الوداع میں اترا ہے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تمام قبائل عرب اسلام لا چکے تھے۔ اور

بعثت سے رسول کی عمر گذر گئی تبلیغ قرآن و شریعت کرتے کرتے توحید و رسالت
اور معاد ایسے اصول دین سے لے کر نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ اور احکام معاملات
قصاص و دیات تک آپ نے سب کی تبلیغ کی اور کبھی نہ ہچکچائے، نہ پس و
پیش کیا، نہ کسی خوف و اندیشہ کے احساس سے متأثر ہوئے۔ پھر آخر ایام
رسالت کی عمر ختم ہونے کے بعد یہ کہنے کے کیا معنی کہ اے رسول تبلیغ کرو
دین و شریعت کی اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو کچھ رسالت پہنچائی ہی نہیں؟
کیا رسول اب تک تبلیغ دین و شریعت نہ کر چکے تھے؟ کیا آپ
خداوندی پیغام دنیا کو نہ پہنچا چکے تھے؟ کیا آپ نے احکام الٰہی سے لوگوں
خبردار نہ کیا تھا؟ پھر آخر اب اس حکم کا حاصل؟

اور پھر آیۂ رسالت کے معنی ہی تبلیغ دین و شریعت کے ہیں۔ اگر
"دین و ما انزل الیک" کو بھی دین و شریعت کے معنی میں لے لیا قرآن پاک
کی یہ آیت معنی سے خالی اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے مجروح ہو کر
بے معنی ہو کے رہ جائے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

مفہوم آیت کا اس وقت یہ ہوگا کہ اے رسول دین و شریعت
تبلیغ کرو۔ اگر تم نے دین و شریعت کی تبلیغ نہیں کی تو تم نے دین و شریعت
تبلیغ نہیں کی۔"

کیا یہ خداوندی تعلیم و بال اندیشان تو زیر ابر داشتند" کا

آمادہ جس کے بعد میرے لیے کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے تب میں اس کا سرانجام کردوں۔

خدا نے بھی اس آیت میں اطمینان ہی کے طور پر یہ وعدہ نہیں کیا ہے اور نہ خبر دی ہے کہ تم جو کچھ تبلیغ کرو گے آ سے سب تسلیم کر لیں گے اور اختلاف نہ کریں گے بلکہ صرف یہ وعدہ کیا ہے کہ تمہاری جان کو ان کے ہاتھ سے کوئی گزند نہ پہنچے گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس حکم کے خلاف مخالفانہ شورش برپا ہوگی اور لوگ اس کے مخالف بھی ہوں گے۔ مگر رسول کی جان کو صدمہ نہیں پہنچے گا۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اگر آیت کا مقصود یہی تھا تو اس میں صاف صاف علی کے نصب خلافت کا ذکر کیوں نہ کر دیا گیا اور نام لے کر تصریح کیوں نہ کر دی گئی۔

مگر غور سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ متکلم قرآنی کی ایک حکیمانہ روش تھی۔ اگر قرآن میں کہیں اس طرح کے مضامین کو صاف صاف نام کی تصریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہوتا تو اس وقت مسلمانوں کے قرآن بھی دو ہو گئے ہوتے۔ ایک قرآن میں وہ آیتیں درج ہوتیں اور ایک میں سرے سے وہ آیتیں درج ہی نہ ہوتیں۔ اس صورت میں جو کچھ حقیقت کا اظہار قرآنی آیات سے اس وقت ہو رہا ہے اتنا بھی نہ

جائے کہ جو عزت جناب امیر کی رسول اللہؐ کے دل میں تھی۔ بالکل وہی دوسروں کی نگا
میں تھی، اس کے علاوہ حضرت علی کی طرف سے ایک عام جذبۂ ناپسندیدگی کا سبب
یہ بھی تھا کہ غزوات میں سب سے زیادہ آپ ہی نے دشمنوں کو قتل کیا تھا اور شاید
ہی کوئی خاندان یا قبیلہ ایسا ہو جو متاثر نہ ہوا ہو۔ ہر چند یہ جو کچھ ہوا سب اسلامی
نقطۂ نظر سے تھا اور اس میں ذاتی اغراض و مقاصد کا مطلقاً کوئی لگاؤ نہ تھا، لیکن
اہل عرب اپنی کینہ پرور طبیعت کی وجہ سے مجبور تھے اور یہ کانٹا ان کے دل سے
کسی طرح نہ نکلتا تھا۔"

"ہر نام" صاحب نے بھی اپنے ابتدائی مضمون میں کافی شواہد اس
امر کے لکھے ہیں کہ کس کس طرح صحابہ حضرت علی[۴] کے معاملہ میں رسول کے رویہ
پر اعتراض و مخالفت کرتے تھے۔ نیز یہ کہ خود رسولؐ کو صحابہ کی نسبت اس
معاملہ میں کتنی بے اطمینانی تھی اور آپ اپنی فراست کی بناء پر گویا دیکھ رہے
تھے کہ کس طرح صحابہ آپ کے بعد علی سے روگردانی کریں گے اور ان کی مخالف
پر کمر بستہ ہو جائیں گے۔

[۵] اس صورت حال کی بناء پر بے شک اصول درایت کے لحاظ سے با
قرین قیاس ہے یہی امر کہ حضرت رسول گو اشارۃً و صراحۃً خاص خاص موقعوں پر
علی کی خلافت کا اظہار کرتے رہتے تھے لیکن آپ کو اس کے عمومی اعلان و اظہا
میں خطرہ کا اندیشہ ہو اور آپ منتظر ہوں کہ خدا کی طرف سے کچھ زور تاکیدی حکم

تمثیلی افسانوں کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا مصداق کوئی اس زمانہ میں تھا ہی نہیں بلکہ حقیقتہً مصداق ہر ایک کا معین تھا مگر قرآن کی "وحی متلو" میں اُس کا نام نہیں ہے۔

اس کے لیے بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ نام تھے اور وہ حذف کر دیئے گئے۔ مگر میں اس کا قائل نہیں ہوں، میں اس کو جیسا کہ میں نے کہا قرآن کی ایک حکیمانہ کارروائی سمجھتا ہوں جس میں مفادِ اسلامی کا پہلو مضمر تھا۔ بعض روایات میں بعض صحابہ کے قرآن میں جو کہیں کہیں بعض ناموں کا بہ تصریح اضافہ ہونا مذکور ہے۔ اسے میں تفسیری نوٹ کی حیثیت سے قرار دیتا ہوں جس سے تعیّن مراد میں مدد ضرور مل سکتی ہے چنانچہ زیر بحث آیت کے متعلق بھی یہ روایت موجود ہے کہ ابن مسعودؓ اس آیت کو بایں الفاظ پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ حضرت رسول کے زمانہ میں وہ یوں ہی پڑھی جاتی تھی کہ :-

" یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک (ان علیا مولی المومنین) وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ (در منثور جلد ۲ صفحہ ۲۹۸)

اس سب کے بعد جہاں تک روایت و درایت کا تعلق ہے میں تو اس میں شک وشبہہ کی گنجائش ہی نہیں پاتا کہ یہ آیت

ہوتا اس لیے یہ قرآن کا ایک خاص حکیمانہ انداز تھا کہ اس نے اپنے مقاصد کو ایک طرح ابہام کے پردہ میں رکھا ہے لیکن قرائن ایسے قائم کیے ہیں جن سے ایک سنجیدہ غور کرنے والا انسان حقیقت تک پہنچ سکتا ہے ورنہ یہ تو یقینی ہے کہ قرآن میں خاص خاص آیتیں منافقین کے تذکرہ پر مشتمل ہیں اور ان کا کوئی نہ کوئی مصداق ضرور ہے مگر نام نہیں لیا گیا۔ سورہ طلاق و تحریم میں رسول اللہ کے بعض ازواج کی نسبت خاص خاص واقعات کی طرف اشارہ موجود ہے۔ ان کا بھی مصداق کوئی ہے مگر نام نہیں لیا۔

اسی طرح سیکڑوں آیات متعدد مواقع پر کثیر التعداد صحابہ کی تنبیہ، تعریف یا مذمت میں اتاری گئیں اور کہیں کسی ایک کا بھی نام نہیں آیا۔ تمام صحابۂ کرام میں صرف "زید بن حارثہ" کا نام قرآن میں لایا گیا۔ فلما قضی زید منھا وطرا زوجنا کھا۔ لیکن زید کی ہستی کسی حیثیت سے مسلمانوں کے درمیان محل اختلاف تھی ہی نہیں کیونکہ زید کی شہادت حیات رسول اللہ ہی میں ہو گئی۔ اور اس مسئلہ کو ابھی مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلافی درجہ حاصل نہ تھا۔ لیکن اس کے علاوہ کسی ایک جگہ بھی کسی کا نام موجود نہیں ہے۔

اس کی وجہ سے یہ تو کہا ہی نہیں جا سکتا کہ یہ تمام آیات فرضی

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ "نص" ہوتا تو اس کے اور کیا الفاظ ہو سکتے تھے؟

اس کے پہلے "وزیر" کہہ چکے "وصی" کہہ چکے "خلیفہ" کہہ چکے "ولی" کہہ چکے۔ اب کہتے ہیں کہ "خدا میرا مولا ہے اور میں تمہارا مولا ہوں۔ اب جس کا میں مولا ہوں اُس کے علی بھی مولا ہیں۔"

اس سے کیا پتہ نہیں چلتا کہ علی کا مولا ہونا اُسی طرح حاکم و متصرف ہونے کی شان سے ہے جس طرح خدا کا اور رسول کا؟ مگر تاویل کی دنیا تنگ نہیں ہے۔ طے ہے کہ ہر معاملہ میں رسول روزمرّہ کی زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ اور وہی معنی سمجھ لیے جاتے ہیں جو عام محاورہ کے مطابق اس لفظ کے ہیں۔ مگر اس معاملۂ خاص میں در بارۂ علی بن ابی طالب جو کچھ رسول کی زبان سے نکلے اُس کو دوسرے معنی پہنا لیے جائیں۔

"خلیفہ" کہا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے اہل و متعلقین میں وہ ان کی جگہ پر ہیں اور "وزیر" کہا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ زندگی بھر وہ آپ کی کمر کو مضبوط رکھنے والے اور "وصی" کہا تو صرف آپ کے قرضوں کے ادا کرنے کے لیے اور "ولی" کہا تو معنی دوست اور "مولا" کہا تو وہ "ناصر" کے معنی ہیں۔

اس طرح یقیناً ایک متکلم گنگ ہو جائے گا۔ الفاظ کا دفتر ختم

حضرت علی کی خلافت ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کے بعد خدا کی ہدایت اس باب میں صراحتہً ظاہر ہے۔

(۴)

حدیث غدیر۔ جس کے متعلق جناب نیاز صاحب نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ "یہ شیعوں کے پاس ولایت جناب امیر کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

اس واقعہ کی تفصیل "سرنام" صاحب نے اپنے مضمون میں لکھی ہے۔ نیز جناب مدیر نگار نے بھی اپنے محاکمہ میں اس کی تکرار کی ہے یہ حضرت رسول کا وہ صاف کھلا ہوا تاریخی اعلان ہے، جس میں شک شبہہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اور اس میں آپ نے یہ ارشاد کیا ہے کہ:۔

"خدا میرا مولا ہے اور میں تمام مومنین کا مولا ہوں، اور اس کے بعد جس کا میں مولا ہوں علی بھی اس کا مولا ہے۔"

خود الفاظ سے ظاہر ہے کہ اس اعلان میں مذہبی شان پائی جاتی ہے یہ کوئی سیاسی مشورہ نہیں ہے نہ ذاتی اظہار خیال ہے۔ بلکہ بحیثیت رسول بحیثیت پیغمبر آپ اپنے بعد کے لیے اعلان کرتے ہیں۔

بعض لوگ حدیث کے معنی میں کلام کرتے ہیں اور اس لیے سمجھتے ہیں کہ "نص" نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مولا کے معنی حاکم و متصرف کے ہیں ہی نہیں۔ مگر نہیں ہیں دہیں تک کہ جہاں تک غدیر خم کے واقعہ کا تعلق ہے لیکن ادھر یہ موقعہ دل سے اترا اور کسی دوسری جگہ مولی کی لفظ آئی۔ پھر اس کے معنی مالک متصرف، حاکم وغیرہ کے اقرار پا جائیں گے۔

ملاحظہ ہو تفسیر سراج منیر خطیب شربینی (مطبوعہ مصر ج ۱ ص۴۰۸)

سورہ انعام۔

" ثم ردّوا ای الخلق الی اللہ ای الی حکمہ وجزائہ مولاھم ای سیدھم ومدبر امورھم کلھا الحق ای ثابت الولایۃ وکل ولایۃ غیرہ تعالی عدم۔"

یعنی قرآن مجید کی اس آیت میں کہ " ثم ردّوا الی اللہ مولاھم الحق" مولا کے معنی ہیں سید و آقا اور امور کا منتظم۔ حق کے یہ معنی ہیں کہ درحقیقت حکومت اسی کی برقرار ہے اور اس کے سوا ہر ایک کی حکومت کالعدم ہے۔

سورہ یونس کی آیت :۔ " وردّوا الی اللہ مولاھم الحق" میں بھی لکھا ہے۔

" مولاھم ای ربھم ومتولی امورھم علی الحقیقۃ۔" یعنی مولا کے معنی ہیں مالک اور ان کے امور کا حقیقی منتظم۔" (سراج منیر جلد ۲ ص۱۹)

ہو جائے گا۔ اور اس کے مافی الضمیر معنی کسی کے ذہن نشین نہ ہوں گے۔ آج کل دنیا "درایت و روایت" پکارتی ہے اور یہاں پر عقل سے کام نہیں لیتے کہ حضرت رسول اپنا سفر قطع کرتے ہیں۔ ہزاروں آدمیوں کو چٹیل بیابان میں، خاص تمازت آفتاب کے وقت مجتمع کرتے ہیں۔ منبر پر جاتے ہیں پرزور الفاظ میں تمہید قائم کرتے ہیں۔ اپنی وفات کی خبر دیتے ہیں لوگوں سے اپنی ہر طرح کی سرداری، حکومت، لوگوں کے نفس پر کامل سلطنت کا اقرار لیتے ہیں اور اس کے بعد کہتے کیا ہیں؟ یہ کہ جس کا میں "دوست" ہوں اس کے علی بھی "دوست" ہیں۔ یا جس کا میں "مددگار" ہوں اس کے علی بھی "مددگار" ہیں۔

آخر یہ کون سی ایسی بات تھی جو لوگوں کے طبیعتوں پر بار ہوا جس کے لیے اپنے اختیارات جتلانے کی ضرورت ہو اور اپنی حکومت کے اقرار لینے کی حاجت ہو؟ اس تمام کارروائی کا حاصل کیا ہوا اور یہ کون سی ایسی بات تھی جس کا اس شد و مد، زور و شور کے ساتھ اعلان ہو پھر یہ کون سا ایسا امر تھا جس پر حضرت عمر بڑھیں اور جناب امیر کو مبارکباد دیں کہ "ھنیئاً لک اصبحت مولیٰ کل مؤمن و مومنۃ" یعنی مبارک ہو آپ کو کہ ہر مومن و مومنہ کے مولا قرار پا گئے "یہ مبارک باد کاہے کی ہے؟ اس کی ہے کہ آپ آج ہر مومن مومنہ کے مددگار بن گئے؟"

پیش کرتے ہیں اور پیش کرنا درست بھی ہے۔ جیسے حدیث منزلت جس میں حضرت رسول نے جناب امیر کو مخاطب کر کے ارشاد کیا ہے۔

"کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم مجھ سے وہی نسبت رکھو جو ہارون کو موسیٰ سے حاصل تھی، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی ہونے والا نہیں ہے۔"

یہ حدیث آپ نے اس وقت ارشاد فرمائی ہے جب غزوۂ تبوک میں رسول اللہ نے اپنے ساتھ تمام صحابہ کو چلنے کا حکم دیا تو حضرت علی کے متعلق ارشاد ہوا کہ وہ مدینہ ہی میں قیام کریں۔

اگر آخر کا فقرہ "الا انہ لا نبی بعدی" نہ ہوتا تو شاید کہا جا سکتا تھا کہ منزلت ہارونی کا تعلق صرف اتنے زمانہ سے تھا جب آنحضر تشریف لیے جا رہے تھے مگر اس جملے نے آکر اپنے قبل میں تعمیم کا نتیجہ دے رہا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ہارون موسیٰ کے جانشین اور نائب اور شریک کار تھے۔ بے شک اگر نبوت کا سلسلہ رسول کے بعد قطع نہ ہوتا تو نبوت بھی جناب امیر کے لیے ثابت ہوتی ہے لیکن چونکہ نبوت کا دروازہ بند ہو گیا، اس لیے خلافت و جانشینی بہ شکل امامت آپ کے لیے ثابت رہے گی۔

حدیث ثقلین جس کو خصوصیت کے ساتھ آنحضرت نے علی بن ابی طالب کے اعلان ولایت کے موقع پر بھی بیان فرمایا اور اس کے

تفسیر بیضاوی میں بھی سورۂ یونس اور انعام دونوں جگہ اس کی تصریح ہے۔

تاج العروس شرح قاموس مصنفہ سید مرتضیٰ زبیدی (مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۳۹۹) میں ہے :-

"المولی ایضاً الولی الذی یلی علیک امرک وھما بمعنی واحد ومنہ الحدیث ایما امرأۃ نکحت بغیر اذن مولٰہا ورواہ بعضہم بغیر اذن ولیہا وروی ابن سلام عن یونس المولی فی الدین ھو الولی وذالک قولہ تعالیٰ ذالک بان اللہ مولی الذین اٰمنوا وان الکافرین لا مولی لھم ای لا ولی لھم ومنہ الحدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ ای من کنت ولیہ"

اس عبارت میں صاف تصریح موجود ہے کہ مولیٰ کے معنی صاحب اختیار اور حاکم کے ہیں اور یہ کہ مولا اور ولی دونوں مترادف حیثیت رکھتے ہیں۔

اگر واقعات کا مطالعہ کرنے والا بے لوث نگاہ رکھتا ہو تو وہ صاف سمجھے گا کہ رسول نے حضرت علی کی خلافت، حکومت و جانشینی کا اعلان کیا اور لوگوں نے بھی اُس وقت یہی سمجھا اور اسی لیے حضرت علی کو مبارکباد دی اور

———(o:o:o ※ o:o:o)———

ان کے علاوہ بھی متعدد احادیث کو شیعہ اپنے مدعا کے اثبات میں

کا تعلق ہے خود مدینگا۔ بھی قائل ہیں کہ رسول کے احکام تمام بربنائے وحی ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ حدیث ثقلین کے بیان فرمانے میں غدیرخم والے خطبہ میں خود آنحضرت صلعم نے صاف صاف اس کو خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :۔" قد نبأنی اللطیف الخبیر انھما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض۔"

(یعنی) مجھ کو خدائے تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں (قرآن اور اہلبیت) ہرگز جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہوں۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا اعلان اہلبیت کے بارے میں صرف اپنی ذاتی رائے سے نہ تھا، بلکہ وحی خداوندی کی بناپر تھا جس کے بعد شک شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

چوتھا سوال

مسئلہ خلافت کو اصل مذہب اسلام سے کیا تعلق ہے؟

میرے خیال میں وہی تعلق جو ایک اہم مذہبی حکم کو کسی مذہب کے

بعد اپنے مرض الموت میں مبتلا ہونے کے بعد بھی ارشاد کیا۔ اس میں تمام امت کو جن میں اس وقت تو صحابۂ کرام ہی تھے اور تمام اکابر داخل تھے اہل بیت کے ساتھ تمسک کا حکم دیا، اور یہ کہ اُن کا دامن چھوڑو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُمت نے اس کے اوپر عمل کس طرح کیا اور اس پر عمل کی صورت کیا تھی جبکہ مذہبی اور سیاسی دونوں طرح کی پیشوائی خلفائے وقت کے لیے حاصل تھی جس کے بعد اہلبیت کی حیثیت ایک معمولی امتی سے زیادہ نہ رہی تھی اور کوئی امتیاز خصوصی ان کے لیے ہرگز حاصل نہ تھا۔

یہ احادیث بے شک "وحی متلو" کی حیثیت نہیں رکھتے یعنی حدیث اور قرآن میں امتیاز ضرور ہے، لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ قرآن کا تعلق فرمانِ خداوندی سے ہے۔ اور دوسرے کا رسول اللہ کی ذاتی رائے سے۔ احادیث رسولؐ بھی اکثر بربنائے وحی ہوتے تھے لیکن خود وحی میں یہ تفرقہ ہے کہ وہ کبھی "وحی متلو" کی حیثیت رکھتی تھی جس کو کہتے ہیں "قرآن" اور کبھی "وحی غیر متلو" جس کی مظہر ہے حدیث۔ اس لیے اکثر مسائل مذہبی یعنی روزہ اور نماز وغیرہ ایسے خالص عبادات کے احکام بھی احادیث سے ثابت ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہاں تک مذہب

تو ہم کو حسب ذیل باتیں معارض نظر آتی ہیں :-

۱- اگر خلافت جناب امیر کے متعلق کوئی نص قطعی موجود ہوتی تو اسے کلام مجید میں ہونا چاہیے تھا حالانکہ نہیں ہے۔

۲- اگر واقعی فرمان خداوندی ایسا ہی ہوتا جیسا کہ حضرات شیعہ سمجھتے ہیں تو علاوہ اس کے کہ دیگر احکام کی طرح نہایت صاف و واضح الفاظ میں اس کا ذکر کلام مجید میں ہوتا۔ رسول اللہ خود اپنے سامنے ہی حضرت علی کی باقاعدہ خلافت سب لوگوں سے تسلیم کرا کے رخصت ہوتے، حالانکہ یہ بھی تاریخ سے ثابت نہیں۔

۳- اگر یہ کوئی خالص مذہبی مسئلہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ حضرت علی خود اس سے واقف ہوتے اور چونکہ وہ احکام مذہبی کے نہایت سخت پابند تھے اس لیے وہ باوجود تمام مخالفتوں کے اپنی خلافت کی کوشش ضرور کرتے، لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کر لی تو آپ خاموش ہو رہے ہم تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کیے لیتے ہیں کہ آپ نے خود حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، لیکن آپ کا اس بیعت کو گوارا کر لینا اسی سے ظاہر ہے کہ آپ صحابہ کے تمام مشوروں میں شریک ہوتے تھے، اور اکثر آپ کی رائے پر عمل بھی کیا جاتا تھا۔

سا کہا ہو سکتا ہے۔ جناب مدیر نگار کی رائے ہے کہ:

وہ یہ کہ اس مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ اصولاً ہونا چاہیے
بلکہ اس کا تعلق صرف سیاسیات سے تھا۔ اس کا سب سے بڑا
ثبوت یہ ہے کہ کلام مجید اس مسئلہ میں ساکت ہے یعنی رسول اللہ کو
وحی کے ذریعہ سے کوئی ہدایت اس باب میں نہیں کی گئی اور اگر
اس کو واقعی کوئی مذہبی اہمیت حاصل ہوتی تو یقیناً وحی کے ذریعہ
اس کا فیصلہ کیا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان کے
بعد جناب امیر خلیفہ قرار دیئے جائیں۔ لیکن اس آرزو کی
حیثیت صرف ایک ذاتی خواہش کی سی تھی جس کو وحی سے کوئی تعلق
نہ تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یوں تو بار بار رسول اللہ
نے جناب امیر کو ولی، مولا، وصی، وزیر کے الفاظ سے یاد کیا لیکن
جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے اس باب میں
خاموشی اختیار کر لی ــــ اگر رسول اللہ کی یہ خواہش کسی
وحی الٰہی کا نتیجہ ہوتی تو آپ بلا پس و پیش نہایت صاف الفاظ
میں اس کا اظہار کر جاتے اور وہ الفاظ کلام مجید میں بھی ہوتے
ــــ اگر حضرات شیعہ کے قول کو صحیح باور کیا جائے

ہے کہ مسئلہ خلافت کوئی مذہبی مسئلہ نہ تھا وہ ناظرین کے پیش نظر ہے اس کے سامنے ایک کاتب کے قلم میں بڑی طاقت کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کو واضح کر سکے۔

آفریں ہے جناب "ہرنام" صاحب کو کہ انھوں نے باوجود اجنبیت اور اظہار عجز و اعتراف قصور کے اپنے آخری مضمون میں اس بحث کے اکثر پہلوؤں کو اتنی خوبصورتی سے روشن کیا ہے جس کے بعد کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں۔

انھوں نے کہا ہے کہ خلافت کا تعلق مذہب سے اسی وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اسے صرف سیاسیات کے شعبہ سے متعلق رکھا جائے لیکن اگر خلافت کی حیثیت اس سے مختلف ہے، اسی بنا پر مسلمانوں کی جانب سے اس کی تعریف کی جاتی ہے یہ کہ:-

"هي نيابة عن النبي في امور الدين والدنيا"

تو اس کا تعلق مذہب سے ظاہر ہے۔

انھوں نے واقعات کی بنا پر یہ بھی دکھلایا ہے کہ پیغمبر نے اس کو بطور ایک سیاسی مسئلہ کے پیش نہیں کیا تھا بلکہ معیار نجات بتایا تھا۔ اور اس پر آخرت کی بازپرس کا حوالہ بھی دیا تھا جس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے اور خالص

اگر حضرت علی حضرت ابو بکر کو غاصب خلیفہ سمجھتے یا ان کی خلافت آپ کے نزدیک خلاف منشاء خدا و ندی ہوتی تو کم از کم آپ یہ ضرور کرتے کہ ان سے ہمیشہ کے لیے کٹ کر علیحدہ ہو جاتے اور مراسم موالات ترک کر دیتے، اگر جنگ کرنا مناسب نہ تھا۔ اگر یہ تمام زمانہ واقعی غاصبانہ دور خلافت کا تھا۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایسا مبغوض عہد تھا جس سے نہ خدا خوش ہو سکتا تھا نہ اس کا رسول، لیکن حیرت ہے کہ جناب میر نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اس غیر اسلامی زمانہ کا ساتھ دینے میں بسر کر دیا۔ اور انھوں نے نہ کبھی صدائے احتجاج بلند کی اور نہ منشائے خدا اور رسول کو پورا کرنے کی کوشش کی ـــــ حضرت علی کا خلفائے ثلاثہ کے زمانہ میں حد درجہ امن پسندانہ زندگی بسر کرنا اور سب کے ساتھ صلاح و مشورہ میں شریک ہونا سوائے اس کے اور کسی سبب کی بناء پر نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ مسئلہ خلافت کو خالص مذہبی مسئلہ نہ سمجھتے تھے بلکہ اس کو سیاسی معاملہ جان کر واقعات و حالات کے لحاظ سے اپنی خلافت پر زور دینا یا اس کے لیے کوشش کرنا مناسب خیال نہ فرماتے تھے"

مذکورہ عبارت میں جس شد و مد کے ساتھ اس کا ثبوت پیش کیا گیا

اس سے معلوم ہوا کہ فرقہ شیعہ کے قول کے لیے جو باتیں بطور معارض پیش کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں ہے۔

خلافت جناب امیر کا اعلان بر بنائے وحی تھا اور وہ وحی قرآن میں بھی موجود ہے اور رسولؐ نے بھی اس کا اظہار کیا اور عام مجمع کے سامنے اعلان کیا۔ روایت میں موجود ہے کہ آپ نے سب سے اقرار لیا کہ کیا میں تم سب کا مولا نہیں ہوں؟ جب سب نے اقرار کیا تب آپ نے یہ کہا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا علی بھی مولا ہے۔

اس سے بڑھ کر اعلان کرنے اور اقرار لینے کی کیا صورت ہو سکتی تھی جبکہ قرآن نے رسولؐ کے فرائض کو بھی اس سے زیادہ نہیں بتلایا ہے ارشاد کیا ہے :۔

" وما علیك الا البلاغ " نیز یہ بھی کہا ہے کہ رسولؐ کا کام جبر کرنا نہیں ہے " وما انت علیھم بمصیطر "

اور ایک جگہ ارشاد ہوا ہے :۔ " انت تکرہ النّاس حتّے یکونوا مؤمنین "

اس اصول کے مطابق یہاں رسول پر فرض یہی عاید کیا گیا تھا کہ وہ تبلیغ کر دیں " یا ایّھا الرّسول بلّغ ما انزل الیك من ربّك " چنانچہ انھوں نے تبلیغ کر دی اور اتنے غیر معمولی اور اہم طریقہ سے کسی حکم کی اس سے

سیاسی مسئلہ نہیں ہے۔ جناب "ہرنام" کا مذکورہ بالا استدلال یقینی بہت مضبوط ہے جس سے ان کی نکتہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ کہنا کہ "کلام مجید اس مسئلہ میں ساکت ہے" اسی وقت تک حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے جب تک حقیقت پر اطلاع نہیں ہے لیکن گذشتہ سوال کے جواب میں ہمارے بیانات نے یہ امر بالکل صاف کر دیا ہے کہ کلام مجید اس مسئلہ میں ساکت نہیں ہے اور یہ کہ رسول اللہؐ کی تبلیغ اس باب میں وحی الٰہی اور ہدایت خداوندی پر مبنی تھی۔

اگر رسول اللہؐ کی نامزدگی کی حیثیت صرف ایک ذاتی رائے کی حیثیت رکھتی تو آپ کو صاف صاف اس کا اظہار کرنا چاہیے تھا کہ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ آپ کو یہ ہرگز روا نہیں تھا کہ بطور حکم مذہبی اس کا اعلان کریں اور اسے نجات اور فلاح اخروی کا معیار قرار دیں۔ کیونکہ ایک نبی سے اگر خطائے اجتہادی ممکن بھی ہو تو بھی یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک غیر مذہبی چیز کو مذہبی لباس میں پیش کرے کیونکہ یہ ایک بدترین فریب دہی اور تلبیس ہے جس کا ایک دیانتدار آدمی کبھی مرتکب نہیں ہو سکتا۔

یہ کہنا کہ "جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے اس باب میں خاموشی اختیار کر لی" یہ بھی واقعہ کے خلاف ہے جس کے متعلق ہرنام صاحب اپنے مضمون میں روشنی ڈال چکے ہیں۔

نگاہوں میں اسلام کی بہت ہی کم وقعت اتنی سی تھی کہ وہ رسول کے پیچھے سے
نمازیں توڑ کے بھاگ نکلتے، چلے جاتے تھے اور رسول کو اکیلا چھوڑ دیتے
تھے۔ جو کفار و مشرکین کو خبر رسانی کرتے تھے۔ جو سامنے آ کر کہتے تھے
کہ ہم آپ پر ایمان لائے اور پیٹھ پیچھے مذاق اڑاتے تھے اور تمسخر کرتے
تھے۔ جو رسول کی طرف گمراہی کی نسبت دیتے تھے جو آپ کی باتوں پہ
اعتراض کرتے تھے اور نبوت میں شک کرتے تھے، لیکن آنحضرت نے ان تمام
باتوں کو انگیز کیا۔ ان لوگوں پر کبھی تشدد نہیں کیا۔ ان کو اپنی جماعت سے باہر
نہیں نکالا۔ ان پر کبھی تلوار نہیں چلائی بلکہ ان کے راز ہائے درونِ پردہ کو
نام لے کر اپنی جانب سے ظاہر بھی نہیں کیا صرف اس لیے کہ زبان سے لا الٰہ
الا اللہ کہتے ہیں تو یہی سہی، ظاہری اسلام کے نام لیوا ہیں یہی سہی، قومیت اسلامی
کی تشکیل ہو گی تو ان میں کھرے افراد پیدا ہو ہی جائیں گے۔

یقیناً اگر حضرت علی اپنے پیش رو کے حقیقی جانشین تھے تو ان کو
اسی تعلیم کو پیش نظر رکھنا ضروری تھا اور اگر آپ ایسا نہ کرتے تو آپ کی
خلافت حقیقی کی صحیح شان ہی باقی نہ رہتی۔

بے شک جس طرح رسول کا فرض تھا کہ وہ غلطیوں پر ٹوکتے رہیں
لغزشوں پر متنبہ کریں۔ کجرویوں کا اظہار کرتے رہیں اور حقیقت کا انکشاف کرتے
رہیں اور بس۔ اسی طرح حضرت علی کا بھی فرض تھا کہ وہ اختیار کردہ رویہ سے

پہلے تبلیغ نہیں کی تھی۔ پھر اب اس کے بعد رسولؐ کیا کرتے اور کس طر
لوگوں سے تسلیم کراتے۔

حضرت علی ضرور واقف تھے کہ یہ مذہبی مسئلہ ہے لیکن ہر مذ
کے اجراء کے لیے ہر حال میں خون ریزی اور مسلمانوں کا قتل عام ض
نہیں ہے آپ فضا سے خوب واقف تھے، آپ جانتے تھے کہ اس ا
ہوا کا رُخ کدھر ہے اور سیلاب کا بہاؤ کس طرف ؟

آپ کو معلوم تھا کہ اس وقت اس حق کا حصول اور اس ذ
کا قیام بغیر عظیم کشت و خون کے نہیں ہو سکتا اور اس طرح کا ہنگام
ہو جانا اس وقت اصل اسلام ہی کے لیے سبب فنا۔

آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ ایک مذہبی مسئلہ کے متعلق رہنما
کس طرح پورا ہوتا ہے ؟ صرف تبلیغ و تلقین سے جس کی تمام منزل
پیغمبر خود طے کر چکے تھے جس سے اتمام حجت پورے طور پر ہو چکا
آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ مسلمانوں کی جماعت میں خود حا
رسولؐ کے زمانہ میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی تھی جن کے دلوں م
اسلامی جاگزیں نہیں ہوئی تھی جو ذرا ذرا سی بات پر پیچھے پلٹ جا
تیار تھے جو رسول پر احسان جتاتے تھے کہ ہم آپ پر اسلام لائے

اگر سیدۂ عالم کی ذات کو اس حدیث کی زد سے الگ کرنا ہے تو ماننا پڑے گا کہ یہ خلافت مذہبی حیثیت سے درست نہ تھی، اسی طرح حضرت علی کا صرف ایک دن کا توقف بھی قبول بیعت میں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ اس کو صحیح خلافت نہ سمجھتے تھے اس لیے کہ موت کے اندیشہ سے کوئی بشر کسی وقت خالی نہیں ہے اور ایک امام جائز کی اطاعت سے انحراف کی صورت میں موت بہرحال موت جاہلیت ہوتی ہے۔ رہ گیا حضرت علی کا ان حضرات کے مشوروں میں شریک ہونا، ان کو صحیح راہ بتلانا اور ان کی موقع بہ موقع رہنمائی کرنا یہی تو درحقیقت دلیل ہے حضرت علی کی اس طہارت ضمیر اور ہمدردی اسلامی کی جو آپ کو حقیقی جانشین رسول و محافظ اسلام کہنے پر مجبور کرتی ہے۔

چونکہ حالات کی بناء پر رسول کے اس حکم سے انحراف ہو گیا جو آپ نے خلافت علی کے اعلان کی صورت میں دیا تھا اور لوگوں نے اپنا فرض کی انجام دہی سے بعد دل کیا تو اب اگر کوئی خود غرض پست طبیعت اور چھوٹے نفس کا انسان ہوتا تو اس کے بعد وہ بددل ہو کر اسلام اور مسلمین کی خدمت سے بالکل جدا اور فلاں مدینہ منورہ کے لیے علیحدہ ہو جاتا لیکن اس سے صاحب یہ نتیجہ نکلا کہ اس شخص کے تعلقات اسلام کے ساتھ ہمدردیاں صرف حصول خلافت کی امید پر تھیں

اپنی ناراضگی نیز اس طرزِ عمل کی غلطی کا اظہار کر دیں۔ چنانچہ آپ نے ایسا کیا۔
اگر شیعوں کی روایت کو نہ بھی مانا جائے کہ حضرت علی نے بالکل حضرت ابو بکر کی بیعت نہیں کی تب بھی تو اتنا تو بربنائے روایت امام بخاری مسلم ہے کہ آپ نے حضرت فاطمہ کی زندگی تک قطعی بیعت نہیں کی اس لیے کہ اس وقت تک آپ کی کچھ نہ کچھ وجاہت مسلمانوں میں سمجھی جاتی تھی۔ لیکن جب حضرت فاطمہ کا انتقال ہو گیا تو لوگ آپ سے بالکل روگرداں ہو گئے
اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول کی اس بیٹی نے جس کو حضرت "سیدۃ نساء العالمین" فرما گئے تھے اور "بضعۃ منّی" کی لفظ سے یاد کر گئے تھے اس نے مرتے مرتے تک اس بیعت کو تسلیم نہیں کیا اور حضرت علی نے بھی اپنی ناراضگی کا ثبوت پیش کیا۔
بقول بعض اہلِ تحقیق حقیقت یہیں سے منکشف ہو جاتی ہے اس لیے کہ مسلمانوں کی متفقہ حدیث ہے "من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتۃ جاھلیۃ"
(یعنی) جو شخص مر جائے اور اپنے امامِ زمانہ کے ساتھ معرفت عقیدت نہ حاصل کرے اس کی موت جاہلیت کی موت ہے" اب مسلمانوں کو غور کرنا چاہیے اپنے رسول کی مقدس بیٹی "سیدۃ نساء العالمین" کی موت کے بارے میں جو بغیر خلیفۂ وقت کی اطاعت کے حاصل ہوئی۔

سول حضرت علیؑ

اس میں کیا کوئی شبہ ہے کہ منافقین کی زندگی کا تمام دور مبغوض ہی ہے جس سے نہ خدا خوش ہو سکتا ہے نہ اُس کا رسول پھر کیا حیرت کا اظہار پایا جا سکتا ہے اس امر پہ کہ حضرت رسول نے اپنی عمر کا کثیر حصہ ان غیر اسلامی زاد کے ساتھ بسر کیا۔

یقیناً اگر رسول کا منافقین کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا اور اسلامی سلوک کرنا اُن کے نفاق کی تائید نہیں ہے جبکہ آیات قرآنی اُن کو ان کے نفاق پہ متنبہ کرتی رہتی تھیں تو اسی طرح حضرت علیؑ کا تعلقات معاشرت قائم رکھنا اُن لوگوں کے ساتھ جنہوں نے مسئلہ خلافت میں رسول کی مخالفت کی اُن کے اس اقدام کی تائید نہیں قرار پا سکتی جبکہ آپ نے اس پر احتجاج کیا اور اظہار اختلاف کر دیا۔ اور جس طرح اُن کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیک برتاؤ اُن کو آخرت میں رستگار و نیک کردار بنانے کا ضامن نہیں ہے اُسی طرح اُن اشخاص کے ساتھ حضرت علی کا یہ حسنِ سلوک اُن کے نجاتِ اُخروی اور نیکو کرداری کا ہرگز ثبوت نہیں ہے۔

یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس مقدمہ میں اصل خلافت اسلامی کے معاملہ میں کتنا ہی حکمِ خداوندی سے کنارہ کشی کی گئی ہو مگر دوسرے معاملات میں اپنے حدود علمی کے اندر بہت حد تک ظاہر اسلامی محفوظ رکھے جانے کو

نیز اگر مسلمانوں نے کبھی ایک حکم مذہبی کی مخالفت کی تو اس کا یہ
اثر تو نہیں ہونا چاہیے کہ اب اسلام کے دوسرے احکام کو بھی بدل جانے
دیا جائے یا خود مذہب اسلام کے صدمات کو گوارا کر لیا جائے۔

حضرت علیؑ کے مشورے ہمیشہ ہی دو نوعیتیں رکھتے تھے، ایک
جب کبھی کوئی مسئلہ شرعی پیش ہوا اور دربار خلافت سے حکم خداوندی کے
خلاف فیصلہ ہونے لگا اس وقت موقع ملا تو علیؑ نے اصلاح کی اور دوسرے
یہ کہ مفاد اسلامی کو کسی جنگ یا دوسری طرح کی دشواری میں نقصان پہنچنے
کا اندیشہ ہوا تو آپ نے صحیح مشورہ دیا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ حفاظت اسلام اور صیانت مذہب کی ذمہ داریاں
آپ کے ساتھ وابستہ تھیں جنھیں آپ کسی نہ کسی طرح انجام دیتے تھے۔ اور
یہی وہ حقیقی خلافت و امامت ہے جو ان کے لیے مخصوص تھی اور جس کے فرائض
وہ کسی نہ کسی پردہ میں ادا ضرور کرتے تھے۔ اگرچہ ظاہری خلافت یعنی مسند
حکومت پر دوسرے افراد نے قبضہ بھی کر لیا ہو۔

حضرت رسول کا سلوک منافقین کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ
جو اکثر آپ کی عدول حکمی کرتے رہتے تھے صاف اسی رویہ کا مظہر ہے۔
آپ نے باوجود ان کے مخالفانہ حالات کے کبھی ان سے ترک موالات
نہیں کیا اور ہمیشہ اصلاح کی کوشش فرماتے رہے۔ اسی طرح جانشین

خون کے دریا بہا دیئے مگر جوش غیظ و غضب کی بنا پر نہیں بلکہ فرض کا احساس
کر کے اور سکوت اختیار کیا تو کمزوری سے نہیں بلکہ مصلحت کا احساس کر کے۔

اُنہوں نے یہ دیکھا کہ وہی اسلام جس کی حفاظت اُس وقت تلوار
کھینچ کر کی جا رہی تھی اُسی کی حفاظت اس وقت تلوار کو نیام میں رکھنے پر موقوف
ہے۔ اس لیے آپ نے اسلام کی موجودہ ظاہری صورت کی بقا کو غنیمت
سمجھا اور فوج کشی و شمشیر زنی سے پرہیز کیا۔

بے شک جب یہ خلافت بنو اُمیہ تک پہنچی اب اسلام کے ظاہری
شعائر بھی مٹائے جا رہے تھے۔ اب احکام مذہبی کے مقابلہ میں کھلم کھلا
مخالفت ہو رہی تھی۔ اب شریعت کے مقابلہ میں صاف بغاوت کا اعلان
تھا۔ اس لیے اُن ہی علیؑ کے فرزند حسینؑ نے کربلا کے معرکہ کو برپا کر کے دنیا
کو دکھلا دیا کہ اُسی اسلام کی حفاظت کے لیے جس طرح ایک وقت میں
فاتحانہ شان سے جنگ کی جا سکتی ہے جس طرح ایک وقت میں مظلومانہ
شان سے سکوت کیا جا سکتا ہے اُسی طرح ایک وقت میں مقہورانہ اور
بیکسانہ شان سے قتل بھی ہوا جا سکتا ہے۔

البتہ حضرت علیؑ نے ابتدائی دور میں جنگ مناسب نہیں سمجھی
لیکن آپ نے اپنے حق خلافت کے اظہار سے بھی کبھی چشم پوشی نہیں کی نیز
کسی دوسرے کے انعقاد خلافت کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لی یہاں تک

اور پابندی شریعت کا اظہار کیا جاتا تھا یعنی شریعت اسلام اور احکام خداوندی کے ساتھ کھلم کھلا بغاوت کا اعلان نہیں تھا۔ محرمات کبائر کی تلقین نہیں تھی۔ بلکہ ان کے اوپر حدود کا اجراء کیا جاتا تھا اور بغیر کسی تاویل و توجیہ کے اس سے اغماض نہیں برتا جاتا تھا۔ اس وجہ سے حقیقت اسلام کو کتنا ہی صدمہ پہنچا ہو لیکن بہرحال اسلام کی ظاہری صورت محفوظ تھی اور چونکہ اس وقت تلوار اٹھانے کی صورت میں یقیناً اسلام کی عمر ختم ہی ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لیے علیؑ ایسے محافظ اسلام نے تلوار نیام میں رکھی اور ۲۵ برس کی طویل مدت اپنے حقوق کی پامالی اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں گزار دی اور خاموش فضا میں ذرا بھی سنسنی پیدا نہیں کی۔

نفسیاتی حیثیت سے دیکھنے کے قابل ہے یہ بات کہ ایک بہادر اور شیر دل انسان جس کی عمر بچپنے سے لے کر جوانی اور بھرپور جوانی تک برابر میدان جنگ میں گزری ہو، جس کی تلوار سے برابر خون ٹپکتا رہا اور جس نے سینکڑوں آدمیوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ اسی کے ساتھ جس نے کبھی شکست نہیں کھائی بلکہ ہمیشہ فتح پائی۔ وہ ایک مرتبہ پچیس برس تک اتنا خاموشی پسند ہو جاتا کہ کوئی ادنے سے ادنے تحریک اس کی جانب سے عمل میں نہیں آتی اور کبھی جنگجویانہ جذبہ کا اظہار اس کی طرف سے نہیں ہوتا۔

کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ علی ایک جذباتی انسان نہیں تھے، انھوں نے

رسول کے بعد اتنی لڑائیاں ہو جائیں، روم و شام کے ممالک فتح ہوں،
ایران و عراق پر اسلامی فوج کشی ہو اور قبائل سے اسلامی جہاد۔ مگر وہی بہادر
ہاں وہی جرنیل اتنی طویل مدت میں کسی ایک لڑائی میں بھی شرکت نہ کرے۔
بالکل علیحدہ رہے ایسا معلوم ہو کہ اُس کے بازوؤں کی طاقت سلب
ہو گئی، اُس کے دل کی ہمت جاتی رہی اور اس کی تلوار کند ہو گئی۔
فوجوں کی سپہ سالاری نئے نئے جرنیلوں کے سپرد ہو۔ خالد بن ولید
سیف اللہ ہو جائیں۔ سعد بن ابی وقاص فاتح عراق و ایران مشہور ہوں مگر
علی کا کہیں نام نظر نہ آسکے۔

بے شک کسی خاص موقعہ پر جب کوئی ایسی ہی ضرورت پیش آ سکے
اور دربار خلافت کی طرف سے مشورہ کے لیے بلائے جائیں تو چلے جائیں
اور اُس وقت صحیح مشورہ دے دیں۔

یہ رزم کا تذکرہ تھا اور جہاد کا مرحلہ، اب علی کارنامہ کا حال سنو،
کہ قرآن کے جمع و تالیف ایسی اہم خدمت جس پر مسلمانوں کی ہمیشہ ہمیشہ کی
زندگی کا انحصار اور علیؑ کی ایسی ذات جس کے متعلق حضرت رسول نے
ارشاد کیا ہو "انا مدینۃ العلم و علی بابھا"
اور خاص طور سے علم القرآن کے لیے یہ فرما کر گواہی دی ہو کہ:-
"علی مع القرآن والقرآن مع علی" اور "لن یفترقا حتی یردا علی الحوض"

کو تیسرے دور میں جب مجلس شوریٰ کے اندر آپ کو بھی ایک رکن قرار دیا تھا آپ نے خاموشی کے ساتھ ووٹ بحق حضرت عثمان نہیں دیا بلکہ پورے شد ومد کے ساتھ اپنے حق خلافت کو مرجح ثابت کیا۔ اور وہ تاریخی خطبہ پڑھا جو دنیا کی تاریخ میں یادگار رہے گا، جس میں تمام احادیث فضائل کو بھی ایک ایک کرکے پیش کیا ہے۔ اور غدیر نیز دوسرے موقعوں کے صریح اعلانات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اور جب جناب عبدالرحمٰن بن عوف نے یہ سیاسی چال چلی کہ جو شخص اپنے تئیں خلافت سے علیحدہ کرلے وہ حکم ہو جائے تو حضرت علی نے فیصلہ اپنے خلاف ہو جانا گوارا کیا، جو صورت حال کی بنا پر پہلے سے یقینی تھا۔ لیکن خود اپنے تئیں خلافت سے علیحدہ کرنا گوارا نہیں کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ اپنی ذمہ داری کو جہاں تک کسی پُرامن طریقہ سے ہو سکتا تھا برابر پورا کرتے رہے اور مسلمانوں کی گمراہی کے اسباب میں خود عملی طور پر شریک نہیں ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت علی خلفاء کے ساتھ حقیقتاً اتحاد رکھتے تھے اور آپ کو کوئی ناگواری اُن حضرات کی خلافت سے نہ تھی، پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ بہادر جرنیل جو ابتدائے بعثت سے لے کر رسولؐ کے آخر عمر تک برابر ہر لڑائی میں علمبردار یا سپہ سالار رہا ہو، جس نے کبھی شکست کی صورت نہ دیکھی ہو، جس کی شجاعت کا بہادرانِ عرب کے دل پر سکہ ہو۔

وہ بلند اخلاقی معیار ہے جو رسول کے بعد علیؑ کو بلند ترین سطح کا انسان ثابت کرتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ آپ نے مذہبی حیثیت سے خلفاء کی خلافت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور آپ کو اس پر اعتراض نہیں تھا۔

پانچواں سوال

اسلام نے بحیثیت اجتماعی کیا اصول پیش کیا ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے نیابت و خلافت کا سلسلہ نامزدگی کے ذریعہ سے یا صحیح تسلیم کرنا اور کسی ایک خاندان کے لیے مخصوص سمجھنا درست ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اس سوال کے متعلق جناب مدیر نگار کا جس پر اس سوال کی بنیاد قائم ہے حسب ذیل ہے:۔

"اسلام جمہوری حکومت کا حامی تھا اور وہ مسئلہ نیابت کی بنیاد خاندانی یا ذاتی وجاہت پر قائم کرنا نہ چاہتا تھا اس لیے رسول اللہ کا اپنے بعد کسی کو نامزد کر جانا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔"

یہ حقیقتاً وہ ایک ہمہ گیر خیال ہے[۹۹] جو اس وقت کی صدی سے تمام دنیا کے دماغ میں مضمر ہے یہاں تک کہ بہت سے افراد شیعہ بھی دانستہ نادانستہ اس کے رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ عراق و ایران کا فتنہ "مشروطہ"

کے الفاظ میں بھی قرآن اور اہل بیت کی دوامی معیت کا ثبوت دیا ہو اور خود علی کا یہ دعویٰ رہا ہو کہ "سلونی عن کل آیۃ من کتاب اللہ عزوجل مجھ سے قرآن کی ہر آیت کے بارے میں سوال کر لو" لیکن جب قرآن کی جمع و تالیف کا مرحلہ پیش آئے تو زید بن ثابت کے خدمات حاصل کیے جائیں، مسجد کے دروازہ پر آدمی بٹھائے جائیں اور ایک ایک سے قرآن کی آیتوں کے متعلق سوال کیا جائے اور دو دو آدمیوں کی گواہی پر آیتیں درج کی جائیں اور بعض آیتیں بڑی جستجو کے بعد کسی ایک صحابی کے پاس دستیاب ہوں اور اسی کے اعتماد پر لکھی جائیں مگر علی کو اس خدمت میں شریک نہ کیا جائے اور ان کا نام تک نظر نہ آئے کہ وہ بھی اس اہم کام میں کوئی دخل رکھتے تھے۔

کیا اس کے بعد یہ دعویٰ قرین قیاس ہے کہ علی اور خلفاء میں اتحاد تھا اور کسی طرح کی کوئی رنجش درمیان میں نہ تھی؟ یا یہ کہنا درست ہے کہ اگر حضرت علی اس خلافت کو جائز تصور کرتے تھے تو آپ کٹ کر علیحدہ ہو جانا اس کے بعد اگر یہ نظر آئے کہ جب کبھی علی کو مشورہ کے لیے بلایا گیا تو آپ نے مشورہ سے عذر نہیں کیا اور مشورہ دے دیا جو حقیقتاً آپ کے نزدیک صحیح تھا تو اسے صرف علی کی بلند نفسی اور عالی ظرفی سمجھنا چاہیے امانت داری و دیانت سمجھنا چاہیے، بے لوثی اور اسلامی ہمدردی سمجھنا چاہیے اور یہی

جمہوریت کے خلاف ہے۔

میرے خیال میں "روح جمہوریت" جسے عام لوگ جمہوریت کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ تو اسی وقت رخصت ہو گئی جب پیغمبر کا انتخاب خدا کی جانب سے ہوا اور عام افراد کو اس میں رائے دہندگی کا حق نہیں دیا گیا۔

احکام و تجویزات پیغمبر کے مقابلہ میں عام افراد کا سلب حقوق اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ صاف صاف اعلان کر دیا: "ماکان لمؤمن ولا مومنة اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرة من امرھم" (یعنی) "ہرگز مسلمانوں میں کسی شخص کو کوئی حق نہیں ہے کہ جب خدا اور رسول کوئی بات طے کر دیں تو انھیں کوئی اختیار باقی رہے اپنے امر میں۔"

بلکہ اسلام نے رسول کے لیے اتنی بڑی مکمل ڈکٹیٹر شپ قرار دی ہے جس کی نظیر دنیا میں ملنا مشکل ہے۔ اس طرح کہ "النبی اولی بالمومنین من انفسھم" (یعنی) نبی کو تمام مومنین پر خود ان کے نفوس سے زائد اختیار ہے۔"

اور جب غدیر کے واقعہ پر نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول نے اپنی اس مستقل حاکمانہ حیثیت (مکمل ڈکٹیٹر شپ) کا حوالہ دیتے ہوئے اور سب سے اس کا اقرار لیتے ہوئے خود اپنے اختیارات امتیازی سے بالکل اپنی ہی حیثیت اپنے ہی اختیار و اقتدار کو اپنے بعد علی کو عطا کیا یہ کہہ کر کہ:- "من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ۔"

مستبدہ [illegible] ایک خیال میں کشمکش کا نتیجہ تھا۔

اور اسی لیے مسلمانوں کی جماعت متعجب ہو گی اگر میں اس کے خلاف اظہار خیال کروں، لیکن کیا کروں کہ کلام پاک اور نیز روایات اسلام کی رُو سے میری سمجھ میں اس کے خلاف ہی آتا ہے۔

جیسا کہ جناب نیاز نے متعدد بار تحریر فرمایا ہے اور حقیقت ثابتہ ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دو حیثیں حاصل تھیں ایک حیثیت معلم روحانی ہونے کی اور دوسری حیثیت حاکم و متصرف ہونے کی ناگزیر لحاظ میں پہلی حیثیت مذہبی ہے اور دوسری سیاسی۔

پہلی حیثیت کے متعلق خیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ براہ راست الہامی چیز ہے اس لیے اس کا تعلق خدا سے ہونا چاہیے لیکن دوسری حیثیت کے لحاظ سے تو پیغمبر ایک بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ جو سیاسی حیثیت سے نافذ الحکم ہو۔

اگر اسلام میں حکومت کی بنیاد بہر صورت جمہوریت ہی پر ہوتی تو خود رسُول کا انتخاب بہ حیثیت حاکم و متصرف کے کسی انتخاب عام اور افراد جماعت کے عمومی اختیار و قرار داد سے ہوا تھا؟۔ اور جب رسُول کی خود مختارانہ بادشاہت میں افراد اُمت کا کوئی دسترس نہیں ہے تو رسُول اگر اپنے بعد کے لیے بحیثیت خلیفہ و جانشین کسی شخص کو حاکم و متصرف قرار دے جائے تو اس میں جمہور کو مداخلت کا کیا حق ہو گا۔ اور کیسے کہنا کہاں صحیح ہو گا کہ یہ اسلام کی روح

کو وہ جانبداری در عایت اور دوسرے لفظوں میں ضمیر کی خرابیوں سے پاک و منزّہ یعنی بالکل معصوم ہے خود اپنی صوابدید سے کسی شخص کو مصالح عامّہ کا ذمہ دار بنایا جائے۔

اس طرح یقیناً تمام افراد کو سمجھ لینا پڑے گا کہ اب کسی کے ساتھ ظلم و تشدد، جبر و استبداد نہ ہوگا اور سب یکساں طور پر حرّیت کی ہوا میں سانس لیں گے اور مساوات کی نعمت سے بہرہ اندوز ہوں گے۔

اس نکتہ کو کافی تفصیل کے ساتھ جناب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب نے اپنے رسالہ "وجود حجت" میں اپنے خاص انداز تحریر میں لکھا ہے جس کا اقتباس درج ذیل ہے:۔

"امام اور بالفاظ دیگر حافظِ شریعت کا تقرر اگر باہمی پنچایت اور انتخاب خود اختیاری و کثرت آراء کی بناء پر ہو تو اس حافظ و نگہبان کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی خود شریعت کے بارے میں اکثریت جس طریقہ پر جائے گی۔ وہی حق سمجھا جائے گا۔ اگرچہ وہ شریعت کی تبدیل و تحریف اور اس کی تراش و خراش ہی کیوں نہ ہو اور اگر نظام شریعت پر عمل در آمد کے بارے میں اکثریت سے غلطی کا احتمال ہے تو حافظِ شریعت کے انتخاب میں اس غلطی کا امکان بہت

اس کے بعد یہ کہنا کہاں صحیح ہے کہ اسلام بروح جمہوریت کا حامی ہے اور اس لیے کسی کو نامزد کرنا روح اسلامی کے خلاف ہے۔

"جمہوریت" یقیناً خوش آیند مفہوم ہے۔ لیکن اس کا اصلی مفاد یہ ہے کہ تمام افراد جامعہ کے حقوق یکساں حیثیت سے محفوظ رہیں اس میں تغلب و تفرق کا اندیشہ نہ ہو۔ یہ اس "جمہوریت" سے جس کی تشکیل دنیا میں ہوا کرتی ہے غیر ممکن ہے۔

جب تک اہل دنیا میں دو طبقے ہیں عوام و خواص اور عوام کی اکثریت ذاتی رائے نہ رکھنے والی بلکہ "بھیڑ یا دھسان" صورت سے ہر پکارنے والے کی آواز پر نا سمجھی سے چلی جانے والی اور خواص کی اکثریت بندۂ ہوا و ہوس ہونے کی جہت سے اغراض شخصیہ کا پتلا اور ذاتی جاہ طلبی و اقتدار پسندی کا مجسمہ ہے۔ اس وقت تک صحیح جمہوریت کا دنیا میں وجود ہو ہی نہیں سکتا اور جسے "جمہوریت" کہا جاتا ہے وہ ایک سخت ترین "معنویانہ" استبداد ہے جسے "جمہوریت" کے نام سے بھولی بھالی جمہور کے سر خواہ مخواہ منڈھا جاتا ہے اور اس دھوکے کی ٹٹی میں اغراض نفسانیہ کا شکار کھیلا جاتا ہے۔

بے شک مفاد "جمہوریت" کے حاصل ہونے کے لیے ایک اطمینان بخش صورت ہے یہ کہ نمائندہ خداوندی جس کے بارے میں یہ حقیقت مسلم ہو چکا ہے

سب کو برابر فائدہ پہنچے اور عالم میں بشری نظام خدائی
منشاء کے مطابق پورے طور پر درست ہو، اگر امامت
ایک ایسے شخص کے سپرد کر دی گئی جو خود خواہشات نفس کا
پابند ہے تو اس سے خود دوسروں پر ظلم وستم کا اندیشہ ہے
چہ جائیکہ اس کے ذریعہ ظالم و مظلوم میں پورے طور سے
انصاف کا فرض انجام پائے۔

بلکہ یہ غرض اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب
اس کا تقرر اس علام الغیوب ہستی کے سپرد کر دیا جائے
جو بنی نوع بشر کے باطنی رموز دینیات سے پورے طور
پر واقف ہے اس سے بڑھ کر مصالح عامہ کا لحاظ کیونکر
ہو سکتا ہے۔

درحقیقت یہ اصول کہ امامت کے انتخاب کو
رسول کے واسطہ سے حضرت باری عزّ اسمہٗ تک منتہی
ہونا چاہیے مکمل طور سے جمہوریت و مساوات پر مبنی ہے
درحقیقت حاضر و مستقبل میں بشری مصالح کی نگہداشت
اور تمام طبقات بشر کے مساوی طور پر حقوق کی حفاظت
جو الٰہی لطف و عدل و حکمت کی روشنی میں انجام پائے

زیادہ ہے۔ ملکی و ملی عہدوں کے انتخابات اور ان کے نتائج ہمارے سامنے ہیں اور ہر شخص ان سے واقف ہے۔ بے جا تائید رعایت، جانبداری، بے انصافی، تقاضائے مروت اور آپس کے تعلقات، موجودہ منافع اور آیندہ کے توقعات، جھوٹے مواعید کا فریب اور بے حقیقت طفل تسلیاں، ذاتی نفوذ و اقتدار اور حکام کی بارگاہ میں بے حقیقت اثر و رسوخ، ظاہری تزک و احتشام اور طمع کار وجاہت و اعزاز یہ چیزیں وہ ہیں جو اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کر دینے کے کامیاب ترین ذرائع ہیں اور اکثریتوں کی تشکیل اکثر و بیشتر ان ہی بنیادوں پر ہوتی ہے۔

امامت کسی محدود جماعت یا مخصوص قریہ، شہر یا صوبہ کی حکومت و سلطنت نہیں ہے بلکہ وہ تمام امت کی مصلحت و انتظام کی ذمہ دار ہے اور جہاں جہاں تک کسی شریعت کا دامن وسیع ہو امامت کو وسعت حاصل ہوگی، وہ ایسا منصب ہے جس کے سبب سے یتیم بچے بیوہ کمزور اور مظلوم، غنی، فقیر، قوی ضعیف

پڑتی ہیں۔

حیرت ہے کہ جو شخص مذہب کی ضرورت ہی کا قائل نہ ہو اور ملائکہ و جنت و نار سب کا منکر ہو وہ مسئلۂ امامت کے ساتھ اتنی دلچسپی کا اظہار کرے اور اپنے رسالہ کے صفحات کو اس سلسلہ کے بڑے بڑے بسیط مضامین کے لیے وقف کر دے۔ یہ راز بالکل سربستہ ہے اور بہرحال "امور مملکت خویش خسرواں دانند" کے مطابق کسی شخص کو اس میں دخل در معقولات کی ضرورت بھی نہیں۔

مارچ ۳۶ء کے پرچہ میں موصوف نے "خلافت امامت" سے متعلق گیارہ سوالات شائع کیے ہیں، جن کے جواب لکھنے کے لیے آپ نے ہر دو مذاہب کے علما و اہل نظر کو دعوت دی ہے۔

جو لوگ ڈاکٹر امبیدکار کی مذہب اسلام کے ساتھ دلچسپی سے فریب خوردہ ہو کر اُن کے سامنے تبلیغ و دعوت کے فرض ادا کرنے اور اس سلسلہ میں اپنے وقت و سرمایہ کے صرف کرنے کو ضروری سمجھے ہوں انھیں مدیر نگار کے اس اعلان پر بھی لبیک کہنا فرض ہے۔ چاہیے نتیجہ میں جس طرح ڈاکٹر امبیدکار کے اعلان و دعوت کی نوعیت ایک سیاسی شعبدہ بازی سے بڑھ کر نہ نکلی اسی طرح مدیر نگار کی جانب سے بھی نتیجتہً مایوسی ہی ہو اور کوئی فائدہ نہ نکلے۔

قیامِ امامت کی ضرورت(۱)

امامت کے بارھویں امام پر ختم ہو جانے کا سبب

اور

امامِ موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہ

(نوشتہ عالیجناب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ مدظلہ)

رسالہ "نگار" میں جو ملک کے مشہور جدت پسند ادیب جناب نیاز فتح پوری کی ادارت میں شائع ہوتا ہے دو برس سے مسئلۂ خلافت و امامت پر ایک عجیب سلسلہ جاری ہے۔

جناب نیاز کے خیالات مذہبیات کے شعبہ میں ہمیشہ دلچسپی کا مرکز رہے ہیں اور ایک زمانہ ہوا جب معجزاتِ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں مجھے بھی موصوف سے دو دو باتیں کرنا

(۱) اسد قائم نمبر ۱۳۵۵ھ

انبیاء کے مبعوث ہونے کی کیا ضرورت تھی؟

قانون قدرت بدل نہیں سکتا، نظام طبیعت پلٹنے کا نہیں، امم سابقہ کی تاریخ کا مطالعہ کرو اقوام عالم کے طبائع وانقلاب پر نظر ڈالو۔ صاحب شریعت رسولوں کے علاوہ ایک ہی شریعت کی تجدید کے لیے متواتر انبیاء کی بعثت کے فلسفہ میں تعمق کرو کس طرح ایک نبی کی ہدایت کا نقش تازہ رکھنے کے لیے برابر اس شریعت کی تعلیم کے لیے انبیاء کی بعثت ہوتی تھی اور یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہتا تھا جب تک کہ مصالح نوعی میں تغیر نہ ہوا اور نظام ارتقاء و تجدد کی بناء پر ایک دوسرا رسول نئی شریعت کے ساتھ مبعوث نہ کیا جائے اسی طرح زمانہ کا کوئی دور کسی ہادی اور رہنمائے حقیقی اور معلم ربانی کے وجود سے خالی نہیں رہا ہے۔ "وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر" "ولکل قوم ھاد" یہی خدا کی حجت ہر زمانہ کے لوگوں پر تمام ہوتی تھی کہ جو ارسال رسل اور بعثت انبیاء کا اصل مقصد ہے۔ "لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل" اور یہی سنت الٰہیہ سابق زمانہ کی امتوں پر برابر قائم تھی۔ "ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا"۔

یہ اُن انبیاء کا تذکرہ ہے جن کی شریعتیں مقید اور جن کی نبوت محدود زمانہ کے ساتھ محدود تھی۔ آسان تھا ایک نبی کے ساتھ دوسرے نبی کا مبعوث ہو کر اس کی شریعت کے نقش کو از سر نو تازہ کر دینا اور دوسری شریعت۔

بہر حال نگار میں یہ سلسلہ جاری ہے اور نگار کی شطرنجی بساط کے مہرے جن میں اکثر اب تک نقاب پوش ہیں وہ اس کے صفحات پر اپنی چالیں دکھلائیں ہی گے جس سے مجھے کوئی بحث نہیں ہے۔ لیکن نگار کے شائع کردہ سوالات میں سے چند سوالات کا تعلق چونکہ حضرت امام ثانی عجل اللہ فرجہ کے ساتھ ہے، لہذا آئندہ کے کالموں میں چاہتا ہوں ان کو حل کر دوں جس سے مجھے مدیر نگار کو کوئی اطمینان دلانا نہیں ہے بلکہ نفس حقیقت کا انکشاف منظور ہے۔

قیام امامت کی ضرورت کیا ہے اور خصوصاً اہلبیتؑ میں اس سلسلہ کا قائم رہنا کیوں ضروری ہے

یہ سوال ہے جس کے پہلے جزو کے متعلق میں اپنے رسالہ "وجود حجت" میں کافی تذکرہ کر چکا ہوں، میں نے لکھا ہے کہ "افراد نوع کی تلون مزاجی اور خواہش پرستی اس امر کی ذمہ دار نہیں ہے کہ ایک مرتبہ صحیح تعلیمات حاصل کرنے کے بعد وہ پورے ثبات و استقامت کے ساتھ ان کو باقی رکھیں، ورنہ کسی ایک نبی کے مبعوث ہونے کے بعد پھر دنیا کو کسی نبیؑ کی ضرورت نہ تھی اور اس صورت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار

بے شک حفاظت ملت و رہنمائی امت کا فرض ادا کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ظاہری طور سے جس کی پشت پر حکومت کا اقتدار اور سلطنت کا جاہ و جلال موجود ہو، اور دوسرے مخفی صورت پر جس میں کارِ ہدایت پردہ کے اندر انجام دیا جائے۔

پہلی صورت یقیناً مقصد کے حصول میں پورے طور پر کامیابی کا واحد ذریعہ ہے۔ لیکن جب عام افراد کا جذبۂ اقتدار پسندی اس غرض کے حصول میں سدِّ راہ ہو جائے تو قدرتاً امام کا فرض دوسرے جزو کی طرف منتقل اور فریضۂ ہدایت کا پردہ کے اندر ادا ہونا ضروری قرار پاتا ہے۔

اب رہا دوسرا جزو کہ صرف اہل بیت میں اس کا قائم رہنا کیوں ضروری ہے؟ نہیں، بالکل ضروری نہیں ہے، یعنی امامت کے شرائط عقلیہ میں ہرگز نہیں ہے کہ وہ اہل بیت ہی میں ہو، اس کے شرائط جو ہیں وہ افضلیت، عصمت اور منصوص من اللہ ہونا ہے۔ یہ خصوصیات اگر اہلبیت کے علاوہ کسی فرد میں پائے جائیں تو یقیناً وہ امامت کا مستحق ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ خصوصیات صرف اہلبیتؑ کے اُن مخصوص افراد میں پائے جاتے ہیں جس کی امامت کا شیعہ اعتقاد رکھتے ہیں اور ان کے علاوہ ان کا موجود ہونا کیسا دنیا میں اس کا کوئی مدعی بھی نہیں ہے۔

یہی ہستیاں وہ ہیں جن کے بارے میں حضرت رسولؐ نے نام بنام

ذریعہ سے نوعِ بشر کی ہدایت کا احیائے ثانیہ ہوتا لیکن ان شریعتوں میں
بھی ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت کے آنے تک اس پہلی شریعت
کی حفاظت وصیانت اور تعلیم وتلقین کے لیے رہنمایانِ خصوصی خدا کی جانب
موجود رہتے تھے۔ پھر وہ نبوت جو صحیفۂ انبیاء کے لیے مہر اختتام ہوا اور جس
خاتمیت کا اعلان "ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین" اور "لا نبی
بعدی" کے صاف وصریح لفظوں میں ہو چکا ہو جس کی انتہا انتہاء دورِ
کی ہم عنان اور جس کا امتداد۔ امتداد عمرِ دنیا کا ہم نفس ہو یعنی اس نبی
نبوت جس کے بعد کوئی نبی اور جس رسول کے بعد کوئی رسول آنے والا
اس نبی ورسول کے انتقال پر اس کی شریعت کے لیے کیا حافظ کی ضرو
نہیں ہے جو اس شریعت کی نگہداری کرے اور افرادِ خلق کو اس کے
کی جانب صحیح رہنمائی کر سکے اسی کا نام امام ہے اور وہی جانشین رسو
اور خلیفہ بالحق کہے جانے کا مستحق ہے۔

کیا ایسے امام کو ہر زمانہ میں موجود رہنا چاہئے؟ بے شک موج
رہنا چاہیے اس لیے کہ ضرورت اس کی ہر زمانہ میں موجود ہے۔ شریعت اسلا
اگر کسی خاص جزو زمانہ سے محدود ہوتی تو حافظ شریعت کا وجود بھی ا
جزو کے ساتھ مخصوص ہوتا لیکن جبکہ شریعت کا دائرہ وسیع اور آخری حد
تک پہنچا ہوا ہے تو اس کی حفاظت کا سامان بھی آخر تک ہونا ضروری ہے

"الا من ارتضی من رسول"

یعنی خدا اپنے رسولوں میں سے جس کو پسند کرتا ہے غیب کی باتوں کا علم عطا بھی فرماتا ہے۔ اور یہ امر مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور حقیقت ثابتہ بھی ہے کہ تمام پیغمبروں میں ہمارے رسول اکرم کا مرتبہ سب سے بلند تھا۔ اس لیے اگر کوئی اور نبی بھی ہوئے "من ارتضی من رسول" کا مصداق تو ہمارے پیغمبر ضرور تھے۔ اس لیے نفی اگر ہوئی ہے تو بذات خود کلیتاً تمام غیب کی باتیں جاننے کی لیکن خصوصی حیثیت سے جن امور کا علم خداوند عالم کی جانب سے عطا ہو جائے ان کی اطلاع حاصل ہونا رسول اللہ کے لیے بلا شبہہ ثابت ہے اگر تھے تو کیوں؟ اس لیے کہ اُن کے معلومات ظاہری ذرائع تک محدود نہ تھے بلکہ اُن کے علم کا بڑا ذریعہ تعلیم و القائے الٰہی تھا۔ اور خود حضرت حق سبحانہ کے علم غیب ہونے میں کوئی کلام نہیں، لہذا جس کو وہ علم عطا فرمائے اس کے عالم ہونے میں کیا شبہہ ہو سکتا ہے؟

اب یہ کہنا کہ آپ کو کیا معلوم ہو سکتا تھا کہ اہل بیت میں کون کس اہلیت کا پیدا ہوگا اور وہ مستحق امامت و خلافت ہوگا یا نہیں؟ اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب خدا کو بھی نہ معلوم ہو سکے اور اگر خدا کو یہ معلوم ہو سکتا ہے تو بہ تعلیم الٰہی رسول کو بھی معلوم ہو سکے گا اور جب آپ نام بنام بتائیں گے کہ میرے بعد یہ اشخاص خلیفہ و امام ہوں گے تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ

اپنی جانشینی و خلافت کے متعلق نص فرمائی اور اُن کو امامت کے لیے نامزد فرمایا اور یہیں سے دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ :-

کیا انبیاء و ائمہ مستقبل کے حالات سے باخبر تھے؟ اگر تھے تو کیوں؟

کیونکہ مدیر نگار نے اپنے محاکمہ میں جو نتائج نکالے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ :-

"چونکہ رسول اللہ عالم الغیب نہیں تھے اور مستقبل کا علم آپ کو حاصل نہیں تھا اس لیے آپ کو کیا معلوم ہو سکتا تھا کہ اہل بیت میں کون کس اہلیت کا پیدا ہوگا؟ اور وہ مستحق امامت و خلافت ہوگا یا نہیں؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ آل رسول کا اصلح و مکمل انسان ہونا حقائق ثابتہ میں سے ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس وقت بھی تمام سادات کو انھیں صفات سے متصف ہونا چاہیے، حالانکہ یہ بالکل خلاف واقعہ ہے۔"

موصوف نے اپنے محاکمہ میں مرتبۂ نبوت کی توضیح کرتے ہوئے بھی یہ بحث کی ہے کہ انبیاء علم غیب نہیں رکھتے تھے اور اس کے ثبوت میں وہ آیتیں پیش کی ہیں جن میں رسول نے ذاتی طور پر اپنے نفس سے علم غیب کی نفی کی ہے حالانکہ اسی قرآن میں یہ موجود ہے۔

"لایزال الدین قائماً حتی تقوم الساعۃ ویکون
علیھم اثنا عشر خلیفۃ کلھم من قریش"
"ہمیشہ دین قائم رہے گا یہاں تک کہ قیامت آئے اور تمام لوگوں کے
خلیفہ بارہ ہوں گے جو سب قریش کے ہوں گے"
دین کے قیامت تک قائم رہنے کی تمہید کے ساتھ افراد بشر میں
بارہ خلفاء ہونے کی خبر دینا صاف طور سے بتلاتا ہے کہ وفات رسول سے روز
قیامت تک کی مجموعی مقدار کہ جس میں دین کا قیام و بقا ہے پورے بارہ
خلفاء پر منقسم ہے۔
(۴) سنن ابوداؤد کی روایت۔
"لایزال ھذا الدین عزیزاً الی اثنی عشر خلیفۃ
کلھم من قریش"
لوگوں کا دین اس وقت تک جاری و نافذ رہے گا کہ جب تک بارہ
خلفاء ان کے والی ہیں کہ جو سب قریش سے ہوں گے۔
(۵) "ان ھذا الامر لا ینقضی حتی یمضی فیھم
اثنا عشر خلیفۃ کلھم من قریش"
یہ "امر دین منقضی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ بارہ خلفاء نہ گذر جائیں
جو سب کے سب قریش ہوں گے۔"

خداوند عالم نے ان اشخاص کو نامزد کیا ہے اور اس نے رسول کی زبان سے اس کی تبلیغ کرائی ہے جس کے بعد ان کے منصوص من اللہ ہونے میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے گا۔

امامت کے بارھویں امام پر ختم ہونیکا کیا سبب ہو سکتا ہے؟

یہی کہ علم الہی میں صفات امامت کا حامل ان ہستیوں کے سوا کوئی اور نہ تھا، اور حضرت رسول نے اپنی جانشینی کے لیے صرف بارہ ہی اشخاص کو نامزد کیا جن کے متعلق فرما بھی دیا کہ وہ قیام قیامت تک باقی رہیں گے ملاحظہ ہوں ذیل کے احادیث۔

(۱) عبد اللہ بن مسعود کی روایت :۔ ینابیع المودۃ مطبوعہ استامبول ص ۲۴۵

"عهد الينا نبينا صلى الله عليه وآله وسلم انه يكون بعده اثنا عشر خليفة بعدد نقباء بنى اسرائيل"

ہمارے رسول نے ہم سے یہ عہد وپیمان قرار دیا ہے کہ آپ کے بعد نقباء بنی اسرائیل کی تعداد کے موافق ۱۲ خلیفہ ہوں گے۔

(۲) صحیح مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

بالکل قابل قبول نہیں جب کہ مذہب کی بنیاد ہی غیب کے اعتقاد پر ہے یعنی جو کسی غائب چیز پر ایمان کو اپنے ذوق مشاہدہ کے لیے ننگ سمجھتا اسے آخری نقطہ سے لے کر اول تک تمام حقائق مذہب کا انکار ضروری لہذا کم از کم ایک صاحب مذہب کو تو یہ حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ کسی حقیقت کا اس بناء پر انکار کرے کہ وہ آنکھوں سے غائب ہے۔

جبکہ وہ کارساز عالم کے وجود کا اقرار کر چکا اور وہ غائب ہے انبیاء کی صداقت کو تسلیم کر چکا اور وہ اس کی آنکھوں کے سامنے نہیں روز محشر اور اس کے خصوصیات نیز جنت و دوزخ کا اقرار کر چکا حالانکہ وہ سب غائب ہیں ملائک پر ایمان لا چکا اور وہ اس کی آنکھوں سے غائب ہیں۔ غرض قرآن مجید اور تعلیمات رسول کریم کے تحت میں نہ معلوم کتنی باتوں پر اسے ایمان لانا پڑا جو اس کے مشاہدہ سے بلند ہیں۔ اتنی غیبی باتوں پر ایمان لانے کے بعد بھی کیا اس کا موقع ہے کہ وہ کسی عقیدہ سے اس لیے روگردانی کرے کہ وہ مشاہدہ سے خارج اور غیب پر مبنی ہے

ان احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ دین کا قیام و بقا ان خلفاء کے دم تک ہے۔ اور حدیث میں تصریح ہے کہ دین کا قیام و بقا روز قیامت تک ہے اس سے صریحی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان بارہ خلفاء کو وفات رسول سے لے کر قیامت تک کی مدت میں موجود رہنا چاہیے اگر ان احادیث کے مفاد پر غور کیا جائے تو یہ احادیث ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کی خلافت کے سوا کسی اور پر منطبق ہی نہیں ہو سکتے اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان ہی کے وجود تک شیرازہ عالم قائم ہے اور ان کے بعد قیامت آنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

امام مستور یا مہدی موعود کے وجود وظہور کی عقلی توجیہ؟

یہی اس کے لیے کافی ہے کہ ایک صادق و مصدق پیغمبر نے اس کی خبر دی اور عقلی حیثیت سے اس میں کوئی استحالہ و امتناع نہیں، جو شخص اسے عقلی حیثیت سے غیر ممکن کہنا چاہتا ہو اسے دلیل پیش کرنا چاہیے۔ یہ کہ ایک موجود ہستی آنکھوں سے اوجھل کس طرح ہو سکتی ہے؟

شیعی جماعت کی طرف سے یہ چیز قطعی و آخری حجت کی حیثیت سے پیش کی گئی ہے۔ اور اس کے "ردّ و قبول" پر فیصلہ کا انحصار ہے۔

میرا ارادہ ہوا تھا کہ اپنی رائے بھی ساتھ ہی ساتھ شائع کر دوں، لیکن چونکہ بدقسمتی سے میرا شمار اُن لوگوں میں ہے جنھیں نہ تشیع سے کوئی واسطہ ہے نہ تسنّن سے (اور اگر ہے تو دونوں سے یکساں) اس لیے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اہل تسنّن کی رائے معلوم کیے بغیر (جو واقعی فریق ثانی کی حیثیت رکھتے ہیں) اس مسئلہ پر کچھ لکھوں۔

بہرحال یہ مقالہ تمام علماء اہل سنت کے سامنے ہے اور نگار کے صفحات اُن کے خیالات گرامی کے اظہار کے لیے کھلے ہوئے ہیں اگر انھوں نے توجہ کی تو یہ نہ صرف میرے لیے بلکہ تمام اہل علم کے لیے باعث مسرت ہوگا، ورنہ بدرجۂ مجبوری مجھی کو وہ کچھ کہنا پڑے گا جس کا دوسرا نام دنیا نے "ناگفتہ بہ" رکھ چھوڑا ہے۔

مضمون سابق مندرجہ نگار پر نگار کا

ادارتی نوٹ

جنوری نمبر ۱۹۳۷ء

(نگار) مسئلۂ خلافت و امامت کے متعلق یہ بالکل پہلا مقالہ ہے جس میں "نقل" سے ہٹ کر "عقل" سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے اور جو عقائدِ اہل تشیع کی "روایتی سطح" پر بھی پوری طرح منطبق ہوتا ہے، میں نے جو چند سوالات قائم کیے تھے ان سے مدعا یہی تھا کہ اس بحث کا علمی پہلو سامنے آجائے اور اسی لیے میں نے سب سے پہلے شیعی علماء کو متوجہ کیا تھا کیونکہ جب تک ان کی "درایت" کا صحیح علم نہ ہو جائے بحث و گفتگو کے حدود متعین نہیں ہو سکتے۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے یہ مقالہ شیعی نقطۂ نظر کی بہترین نمائندگی کرتا ہے اور اس سے زیادہ اگر کچھ لکھا جا سکتا ہے تو وہ اس کی "شرح و بسط" ہوگی، الغرض

(نومبر سنہ)

نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	محصول ڈاک
۶۰	صحیفۂ سجادیہ کی عظمت	۲ر	ـہ/
۶۱	خلافت و امامت حصۂ پنجم	۸ر	ـلـ/
۶۲	خدا کی معرفت	۱۱ر	ـلـ/
۶۳	شہدائے کربلا حصۂ سوم	۶ر	ـلـ/
۶۴	خلافت و امامت حصۂ ششم	۱۱ر	ـلـ/
۶۵	دی لاسٹ مسیح آف حسین	۳ر	ـہ/
۶۶	ہمارے رسوم و قیود	۳ر	ـہ/
۶۷	شیعوں کی تازہ زندگی	۲ر	ـہ/
۶۸	صحیفۂ اعمال مترجم	عہ/	ـ۳ـ/
۶۹	مذہب شیعہ اور تبلیغ	۲ر	ـہ/
۷۰	اسیری اہل حرم	۳ر	ـہ/
۷۲	نظام زندگی حصۂ اول	۶ر	ـلـ/
۷۳	〃 حصۂ دوم	۷ر	ـلـ/
۷۴	حقیقت اسلام	۲ر	ـہ/
۷۵	مظلوم کربلا	۳ر	ـہ/
۷۶	دی مارٹر آف کربلا انگریزی	۱۰ر	ـہ/
۷۷	تناسخ پر مختصر بحث	۳ر	ـہ/
۷	نظام زندگی حصۂ سوم	۹ر	ـلـ/
۷۹	حیات قومی	۲ر	ـہ/
۸۰	جبر و اختیار	۲ر	ـہ/
۸۰	مذہب اور عقل	۱۲ر	ـہ/
۸۲	حسین کا پیغام عالم انسانیت کے نام گجراتی ترجمہ	۳ر	ـہ/
۸۳	سندھی ترجمہ	۳ر	ـہ/

نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	محصول ڈاک
۸۴	ہندی ترجمہ	۲ر	ـہ/
۸۵	بنگالی ترجمہ	۳ر	ـہ/
۸۶	ذرات ازلی نہیں اردو	۲ر	ـہ/
۸۷	اقوام عالم میں عورت کا معیار	۶ر	ـلـ/
۸۸	نظام زندگی حصۂ چہارم	۱۰ر	ـلـ/
۸۹	جبر و اختیار قسط دوم	۲ر	ـہ/
۹۰	مسئلۂ دعا	۲ر	ـہ/
۹۱	صلح اور جنگ	۴ر	ـہ/
۹۲	اثبات حجت	۳ر	ـہ/
۹۳	شیعہ علم کلام کی برتری	۲ر	ـہ/
۹۴	مذہب و سیاست	۴ر	ـہ/
۹۵	عہد مامون اور امام رضا	۶ر	ـہ/
۹۶	مسائل و دلائل	۱۱ر	ـلـ/
۹۷	رہبر کامل پہلے امام کی سوانح عمری	۲ر	ـہ/
۹۸	عربی مرثیہ کی مختصر تاریخ	۱۲ر	ـلـ/
۹۹	امام حسین مسیح آف دی نیشن انگریزی	۲ر	ـہ/
۱۰۰	سید سجاد۔ چوتھے امام کی سوانح عمری	۲ر	ـہ/
۱۰۱	پانچویں امام کی سوانح عمری	۲ر	ـہ/
۱۰۲	شہید کربلا۔ امام حسین کی سوانح عمری	۲ر	ـہ/
۱۰۳	حسن مجتبیٰ دوسرے امام کی 〃	۲ر	ـہ/
۱۰۴	صادق آل محمد چھٹے امام کی 〃	۲ر	ـہ/
۱۰۵	موسیٰ کاظم۔ ساتویں امام کی 〃	۲ر	ـہ/

کتب زیر طبع۔ آٹھویں امام سے لیکر بارہویں امام تک اور ہر ایک کی قیمت ۲ر ہر ایک پر محصول (ـہ/)

تکرارِ طلب یا تقاضا

(نگار فروری ۳۷ء)

سنّی علمائے کرام سے۔ جنوری ۳۷ء کے نگار میں جو مقالہ مسئلۂ خلافت و امامت پر شائع ہوا ہے وہ شیعی نقطۂ نظر سے ایسا صاف و روشن مقالہ ہے کہ اگر اس کو سامنے رکھ کر جواب دینے کی کوشش کی جائے تو بہت سی اُلجھنیں دُور ہو سکتی ہیں۔

کیونکہ اس بحث کو میں نے جس پہلو سے اُٹھایا ہے اور جس مخصوص انداز سے دلائل پیش کرنے کی پابندی میں نے عائد کی ہے اُس نے گفتگو کی نوعیت کو بالکل بدل دیا ہے۔

اب نتیجہ تک پہنچنے کے لیے صرف ایک منزل درمیان کی اور باقی رہ گئی ہے یعنی یہ کہ سُنّی علمائے کرام جنوری کے مضمون کو سامنے رکھ کر اپنی تحقیقات پیش کریں۔ میں خود اُس وقت تک کچھ نہیں لکھنا چاہتا جب تک کہ فریقِ ثانی کو اظہارِ خیال کا موقعہ نہ دیا جائے۔ اُمید ہے کہ جن حضرات کو اس مقالہ کی موافقت یا مخالفت کرنا ہے وہ جلد توجہ فرمائیں تا کہ جولائی تک مجھے بھی اظہارِ خیال کا موقعہ مل سکے۔

تمام شد حصۂ سوم

(نومبر ۳۵ء)

فہرست امامیہ مشن بک ایجنسی لکھنؤ

نمبر رسالہ	نام رسالہ	[illegible]	[illegible]	نمبر رسالہ	نام رسالہ
۱	کائنات قبل از اسلام	۲ر	؎ر	۱۱	ثبوت تقیہ
۲	قاتلان حسین کی گرفتاری	۱۲ر	۲/ر	۱۲	شادی خانہ آبادی
۳	گنج دینیات	عہ/	۲/ر	۱۳	گاؤکشی اور مسلمان
۴	ذخیرۃ الاحکام	۴ر	۱/ر	۱۴	ہمارے نبی
۵	صحیفۂ تجلی	۱۲ر	۱/ر	۱۵	ہدایت الاطفال
۶	رجال بخاری حصہ دوم	۹ر	۱/ر	۱۶	ہدیۂ آصفیہ
۷	الہامی کلمات	۵ر	۱/ر	۱۷	گل عصمت
۱۰	محافل و مجالس چہاردہ			۱۸	تاریخ حسینی
	معصومین علیہ السلام	۸عہ/	۲/ر	۱۹	مقدمہ تفسیر قرآن

ملنے کا پتہ

سکریٹری امامیہ مشن رجسٹرڈ لکھنؤ

نوٹ

اس سے قبل کی کل فہرستیں منسوخ سمجھی جائیں

مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ رسالہ نمبر ۵